جب عمر کی گٹھڑی کھول گئی

اصغر علی جاوید

FARAH PUBLICATIONS

اصغر علی جاوید

ایک معروف ماہر تعلیم، آئینی قوانین کے سینئر اُستاد، کالم نگار، مذہبی اسکالر اور صدارتی ایوارڈ یافتہ سیرت نگار ہیں۔ ان کا ادبی سفر کچھ یوں ہے:

فکشن

۱۔ دکھوں کے صحرا میں تنہا لڑکی (افسانے)
۲۔ بے منزل مسافتیں (افسانے)

نان فکشن

۳۔ جنھیں ہم جانتے ہیں (سوانحی مضامین)
۴۔ جو بچے ہیں سنگ (کالمز اور مضامین)
۵۔ حقائق اور بھی تو ہیں (حقائق حقائق میں، پر تنقید)
۶۔ جب عمر کی گٹھڑی کھولی گئی (ایک صدی کی دل موہ لینے والی نظمیں)
۷۔ کم یاب ہیں ہم (حوادث و مشاہدات)
۸۔ نایاب ہیں ہم (زیر ترتیب خود نوشت)

دینی ادب

۹۔ عورت، مغرب اور اسلام (سلمان رشدی کی 'شیطانی آیات' پر تنقید)
۱۰۔ رب رحیم (اسم حسنیٰ 'رب رحیم' پر تحقیق)
۱۱۔ حضورؐ کی حیات پاک (سیرت النبیؐ)
۱۲۔ الحدیث (علم حدیث پر ابتدائی کتاب)
۱۳۔ حیاتی حضورؐ دی (پنجابی کی پہلی جامع اور مستند سیرت النبیؐ۔ صدارتی ایوارڈ یافتہ)
۱۴۔ The Excellent Examplar SAW
(مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انگریزی زبان میں لکھی گئی سیرت النبیؐ۔ زیر ترتیب)

فرح پبلی کیشنز شیخوپورہ

جب عمر کی گٹھڑی کھولی گئی

(اُردو کی منتخب تاثراتی نظمیں)

انتخاب : اصغر علی جاوید

Jab Umr Ki Gathri Kholi Gaiye

(Heart touching poems of all time)

By: Asghar Ali Javed

First Edition : 2023 / 700

FARAH PUBLICATIONS, Shukat Ali Road, off

Tariq Road,Sheikhupura.

Tel: 056-386-4248, 0334-4005060

Email:asgharalijaved53@gmail.com

نام کتاب:	جب عمر کی گٹھڑی کھولی گئی
	(اُردو کی تأثراتی نظمیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گی)
مرتّبہ:	اصغر علی جاوید
اشاعتِ اوّل:	2023ء
کمپوزنگ:	اشرف نقوی 0345-6352439
پبلشر:	فرح پبلی کیشنز، شوکت علی روڈ، آف طارق روڈ شیخوپورہ
رابطہ:	056-3864248, 0334-4005060
قیمت:	-/500 روپے
تعداد:	700

فرح پبلی کیشنز، شوکت علی روڈ، آف طارق روڈ شیخوپورہ

محترمہ فرحت جاوید کے نام

جنھیں نظم سے بہت پیار تھا

Good Poetry ,I feel, comes from authentic human emotions. It is when I unearth the deepest, darkest, purest and most truthful expressions of how I feel and how I view the world.

Natalia Lazarus

فہرست

جمال اور تاثیر کی حامل نظمیں

اصغر علی جاوید کا شمار وطنِ عزیز کے معروف اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔افسانہ نگار، صدارتی ایوارڈ یافتہ سیرت نگار، کالم نگار اور دانش ور ہیں، 'عورت، مغرب اور اسلام' نامی کتاب کی اشاعت سے شہرت میں اضافہ ہوا۔ یہ کتاب بعدازاں بین الاقوامی جامعات کے نصاب کا حصہ بنی۔ ان کی کتاب 'ربِّ رحیم' یہ بتاتی ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی رحیم ہونے کی صفت باقی صفات پر فائق ہے۔ انھوں نے قرآنی آیات سے بہ تحقیق ثابت کیا ہے کہ ہمارا رب ڈرانے اور عذاب دینے کی نسبت معاف کر دینے والا اور اپنی شانِ رحمت سے نوازنے والا زیادہ ہے۔ 'وہ جنھیں ہم جانتے ہیں' سماجی اور سیاسی حیثیت کے حامل لوگوں کا بائیوگرافیکل تعارف ہے۔اس کتاب میں ہماری تاریخ کے وہ گُہر ہائے آب دار شامل ہیں جنھیں وقت کی دُھول چاٹ رہی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ ہماری تاریخ کے اُن شعرائے عظّام کی نظمیہ کاوشوں کا ماحصل ہے جنھوں نے اپنے پیچھے بھرپور تاثر کی حامل نظمیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان نظموں کا اختصاص یہ ہے کہ یہ وقت اور سرحدوں کی قید سے آزاد ہیں۔ خوب صورت لہجے کی حامل اُردو زبان بولنے والے لوگ وہ خواہ سرحدی لکیر کے اِس پار ہوں یا اُس پار، وہ ایک کڑے معیار کے بعد اِس مجموعے کی زینت بنے ہیں۔

ہجرت ہماری تاریخ کا وہ المیاتی باب ہے جس نے انسانی اور سماجی سطح پر بہت سارے مسائل کو جنم دیا۔ اِس کے نتیجے میں صدیوں سے اکٹھے رہنے والے خاندان پل بھر میں جدا ہو گئے اور پھر ایک مستقل لکیر کی زد میں آ کر حسرت و یاس اور ناسٹلجیا کی زندگی گزارنے پر مجبور ٹھہرے۔ وقت کے فیصلے کے نتیجے میں سیاسی سطح پر جنم لینے والے اختلافات بعدازاں سماجی اور نفسیاتی سطح پر انسان کو خلجان میں مبتلا کرتے چلے گئے۔ 1947 میں ہند کے شاعر و صوت گرو

افسانہ نویسوں کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔

اصغر علی جاوید نے حاکمانِ وقت کے ہاتھوں کھینچی گئی اس لکیر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پار اُلار کے اُن تمام شعراء کو اِس مجموعے کا حصہ بنا دیا ہے جن تک آپ کی رسائی ہوئی یا جو آپ کے ذوق اور معیار کے مطابق قرار پائے۔ اس میں کچھ تو وہ شاعر ہیں جو پاکستان کے نام سے شناخت پانے والے علاقے میں پیدا ہوئے اور پھر ہندوستان میں ہجرت کر گئے اور کچھ وہ ہیں جو پیدا تو ہندوستانی علاقے میں ہوئے لیکن سکونت یہاں پر اختیار کی۔

اصغر علی جاوید کا ذوقِ جمال تأثراتی ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی و تدوینی کام کے لیے ان نظموں کا انتخاب کیا ہے جو بھرپور تاثیر کی حامل ہیں۔ ان کے نزدیک نظم کا علامتی پیرایہ یا لسانی ڈکشن کسی بھی نظم کے بڑا ہونے کی علامت نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں وہ نظم بڑے استھان کا درجہ رکھتی ہے جو اپنے اندر جمالیاتی سطح پر بھرپور ابلاغ رکھتی ہے۔ اس کے لیے وہ نظم کی کسی بھی قسم کی لسانی تشکیل اور تشکیلی عناصر پر اتنا دھیان نہیں دیتے جتنا اس کے جمالیاتی اور تاثیری عناصر پر توجہ دیتے ہیں۔ تأثراتی اندازِ نظر میں یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ انسان بہت ساری چیزوں کو پس انداز کر دے لیکن بوقتِ انتخاب ایک مرتب کسی تھیوری یا اصول کو بروئے کار لا کر ہی اسے انجام دے سکتا ہے۔ تاثیر اور جمالیات کسی علامتی یا لسانی تشکیل کی حامل نظم میں بھی ہو سکتی ہے اور کسی سیدھی سادی بیانیہ نظم میں بھی۔

اُردو نظم کا نقشِ اوّل دکن میں تیار ہوا۔ بعد ازاں یہ دِلّی و لکھنؤ کی سیر کرتی ہوئی سرزمینِ پنجاب میں وارد ہوئی اور لاہور شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ اِس جہاں گردی کے دوران اس نے بہت سارے روپ بدلے اور اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ دکن میں یہ مثنوی کے لباس کو زیبِ تن کیے رکھتی تھی۔ اپنے اِسی لباس میں یہ دلی و لکھنؤ پہنچی اور وہاں اس نے مخمس اور مسدس کے لبادے پہنے۔ بعد ازاں یہ معریٰ شال اوڑھ کر اگلی منزلیں مارنے لگی۔ زمانہ بدلا تو اِس نے بھی اپنا چولا بدلا۔ اس نے اپنے ''بحوری لباس'' کے ارکان میں کمی بیشی کی اور زمانے کے ہاتھوں آزاد نظم کا

نام پایا۔آج کل یہ بحر کی حدود سے باہر رہ کرنثمیہ صورت میں موجود ہے۔

اصغرعلی جاوید نے اِس کتاب کی تشکیل میں نظموں کے انتخاب کے ساتھ ساتھ ان کے خالق شعرائے کرام کے سوانحی شذرے بھی قلم بند کیے ہیں۔ یہ شذرے جہاں نظم کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتے ہیں وہیں پر شعراء کے بارے میں کسی قدر معلومات بھی مل جاتی ہیں۔ جدید نظم اپنے خالق کے بغیر ایڑیاں اُٹھا کر کھڑی ہے لیکن اصغرعلی جاوید نے ان یادگار نظموں کے خالق شعراء کو بھی برابر یاد رکھا ہے۔ ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ اس انتخاب میں فلاں نظم شامل کیوں نہیں ہے اور فلاں کیوں شامل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ذوق کا انفرادی معاملہ ہے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ انتخاب میں شامل نظموں کا تاثیری اور جمالیاتی پہلو اِس قدر مضبوط ہے کہ ان سے آنکھ چُرانا کسی طور ممکن نہیں ہے۔

اصغرعلی جاوید کی یہ گراں قدر کاوش نظم سے حظ اُٹھانے کی بھرپور کوشش ہے۔ انھوں نے نظم کے تفہیمی پہلو سے زیادہ اس کے تاثیری پہلو کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ شعر و ادب کے وہ قارئین جو اُردو نظم کو بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر رکھ دیتے ہیں، آپ کا یہ انتخاب ایسے لوگوں کے لیے نظم سے موانست اور موافقت پیدا کرنے کا باعث بنے گا۔ مجھے یقین ہے کہ صاحبِ ذوق لوگوں کے لیے یہ نظمیں اہم ترین جمالیاتی یافت ثابت ہوں گی۔

ڈاکٹر محمد اکرم سُرا

صدر شعبہ اُردو

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، شیخوپورہ

13

مولانا الطاف حسین حالؔی

پیدائش: 1837 .... پانی پت، انڈیا

وفات: 31 دسمبر، 1914ء ...... پانی پت، انڈیا

اُردو نثر و نظم کے مجدّد، فنِ تنقید کے بانی، شاعر، نثر نگار، نقاد، صاحبِ طرز سوانح نگار، حافظِ قرآن اور مصلحِ قوم خواجہ الطاف حسین حالؔی 1837ء میں پانی پت میں خواجہ ایزد بخش کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعرانہ ذہن سازی میں شیفتہ کی صحبت کا بڑا دخل تھا۔ آپ غالب کے معتقد بھی رہے اور اُن سے اصلاح بھی لی لیکن شاعری میں اُن کو اپنا آئیڈیل نہیں بنایا۔ 'حیاتِ سعدی'، 'حیاتِ جاوید'، 'یادگارِ غالب' اور 'مقدمہ شعر و شاعری' آپ کے ناقابلِ فراموش کارنامے ہیں۔ 'مقدمہ شعر و شاعری' کے ذریعے آپ نے باقاعدہ تنقید کی بنیاد رکھی۔ اپنے مزاج اور رُجحان کی وجہ سے 19 ویں صدی کے رُبع آخر میں آپ سر سیّد کے بہت قریب ہو چکے تھے۔ سر سیّد نے ہی حالی کو مُسلم اُمّہ کی زبوں حالی پر ایک طویل نظم لکھنے کا کہا جسے 'مدّ و جزرِ اسلام' کا نام دیا گیا۔ یہ مسدّس کے پیرائے میں لکھی گئی اور 1879ء میں منظرِ عام پر آئی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں قرآن کے بعد سب سے زیادہ اشاعت پذیر ہونے والی کتاب 'مسدّسِ حالی' ہے۔

اسلامیانِ ہند کو مسدّس سے اتنی عقیدت تھی کہ سر سیّد کہا کرتے تھے کہ جب اللہ روزِ حساب مجھ سے پوچھے گا کہ کہو سیّد احمد کیا لائے ہو تو میں عرض کروں گا کہ حالی سے مسدّس لکھوا کے لایا ہوں۔ ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند نے جن اشعار کو سب سے زیادہ پڑھا ہوگا، وہ درج ذیل مسدّسی بند ہوں گے۔ آپ بھی پڑھیئے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی ، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے در گزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کو زیر و زبر کر نے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حِرا سے سُوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خاک کو جس نے کُندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اِک آن میں اُس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

علامہ اقبال

پیدائش: 9۔نومبر، 1877ء ...... سیالکوٹ، پاکستان

وفات: 21۔اپریل، 1938ء ...... لاہور، پاکستان

علامہ شیخ محمد اقبال، جنھیں شاعرِ مشرق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اپنے فلسفہ، شاعری اور سیاسی خدمات کی وجہ سے دُنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اُردو، فارسی اور انگریزی میں لکھا اور بے پناہ پذیرائی حاصل کی۔ اُن کی نظم 'شکوہ'، 'جواب شکوہ' اور 'مسجد قرطبہ' بہت مقبول ہوئیں۔

علامہ اقبال کی فارسی شاعری انقلاب ایران کی وجوہات میں سے ایک ہے۔ عالمِ اسلام کے ایک عظیم الشان مفکّر کی حیثیت سے دُنیا بھر میں اُن کی پہچان اُن کے خطبات کے بعد بنی جو اُنھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں دیے۔ فلسفہ اسلام پر یہ خطبات ازاں بعد 1930ء میں The Reconstruction of ReligiousThought in Islam کے نام سے شائع ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ 21۔اپریل، 1938ء کو پنجاب کے انگریز گورنر سر ولیم ہڈسن نے سر عبدالقادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''سر قادر! آج تم ہندوستان کے آخری مسلمان کو لحد میں اُتار رہے ہو''۔

اِس مجموعے کے لیے ہم نے اُن کی مشہورِ زمانہ نظمیں 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' اور 'فاطمہ بنت عبداللہ' منتخب کی ہیں۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

نغمۂ بُلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اِسی زنجیرِ عالم گیر میں ہر شے اسیر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِ مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے، لطفِ زیر و بم رہتا نہیں

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اِک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہیں

جانتا ہوں آہ میں، آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مِری فطرت کا ساز

میرے لب پر قصۂ نیرنگیِ دوراں نہیں
دل مِرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں

پر تِری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ! یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقلِ سنگ دل شرمندہ ہے

موجِ دُودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مِرا
گنجِ آورد سے معمور ہے دامن مِرا

حیرتی ہوں میں تِری تصویر کے اعجاز کا
رُخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا

رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا
عہدِ طِفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا

جب تِرے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
دُنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور

زندگی کی اوج گاہوں سے اُتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا!

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دُنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تُو چل بسی

وہ جواں، قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا

تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تُو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر!

کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں!

کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت

موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

نے مجالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے، اِک طوقِ گلو افشار ہے

قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اِک متاعِ دیدۂ تر کے سِوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پسِ نہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی

سینہ چاک اِس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا

جھاڑیاں، جن کے قفس میں قید ہے آہِ خزاں
سبز کر دے گی انھیں بادِ بہارِ جاوداں

خفتہ خاکِ پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے
جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ
پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا توڑنے میں اِس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
اِس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

آہ سیمابِ پریشاں، انجمِ گردوں فروز شوخ یہ چنگاریاں، ممنونِ شب ہے جن کا سوز
عقل جس سے سر بہ زانو ہے وہ مدت ان کی ہے سرگزشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہے
پھر یہ انساں، آں سُوئے افلاک ہے جس کی نظر قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثالِ شمع روشن محفلِ قدرت میں ہے آسماں اِک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے
جس کی نادانی صداقت کے لیے بے تاب ہے جس کا ناخن سازِ ہستی کے لیے مضراب ہے

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا

تخمِ گُل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے کس قدر نشوونما کے واسطے بے تاب ہے
زندگی کا شعلہ اِس دانے میں جو مستور ہے خود نمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے

سردیِ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں　　خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ　　موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
ہے لحد اِس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند　　ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت، تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے　　خواب کے پردے میں بیداری کا اِک پیغام ہے

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اِس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

کہتے ہیں اہلِ جہاں دردِ اجل ہے لادوا　　زخمِ فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا
دل مگر، غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے　　حلقۂ زنجیرِ صبح و شام سے آزاد ہے
وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں　　وقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں
سر پہ آجاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں　　اشکِ پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں
ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے　　خونِ دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے
آدمی تابِ شکیبائی سے گو محروم ہے　　اس کی فطرت میں یہ اِک احساس نامعلوم ہے

ق

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں　　آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
رختِ ہستی خاک، غم کی شعلہ افشانی سے ہے　　سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے

آہ، یہ ضبطِ فغاں، غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دل آسائی ، فراموشی نہیں

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح　　داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ　　بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ
سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے　　سینکڑوں نغموں سے بادِ صبح دم آباد ہے
خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رودبار　　ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہم کنار

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

دامِ سیمینِ تخیل ہے مرا آفاق گیر کرلیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات جلوہ گاہیں اِس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم ہ راہ ہے آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے

نورِ فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزۂ نو رستہ اِس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆☆☆

فاطمہ بنت عبداللہ

عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی

۱۹۱۲ء

فاطمہ! تُو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

یہ سعادت، حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقّائی تری قسمت میں تھی

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

یہ کلی بھی اِس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب! اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اِس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ اُن کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں اُن کی اِس مرقد سے میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نُور

جو ابھی اُبھرے ہیں ظلمت خانۂ ایّام سے
جن کی ضَو ناآشنا ہے قیدِ صبح و شام سے

جن کی تابانی میں اندازِ کُہن بھی، نَو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

☆☆☆☆☆

اِبنِ انشاء

پیدائش:15۔جون،1927ء .... جالندھر،انڈیا

وفات:11۔جنوری،1978 ء ...... کراچی، پاکستان

شیر محمد خاں، مایوس صحرائی، قیصر.................. اور اب اِبنِ انشاء کے نام سے دلوں میں محفوظ شخص ایک انتہائی حساس فنکار تھا۔ وہ شاعر، سفر نامہ نگار، کالم نگار اور مزاح نگار تھا اور ہر روپ میں مکمّل تھا۔ اُس نے جو بھی لکھا، کمال لکھا۔ وہ رشید احمد صدیقی، چراغ حسن حسرت اور ایڈگر ایلن پو(Edger Allen Poe) سے متأثر تھا لیکن اُس نے منفرد اور جداگانہ انداز ہی اپنایا۔ 'اُردو کی آخری کتاب' اور 'خمارِ گندم' اُس کی بہترین مثالیں ہیں۔

ابنِ انشاء کینسر کے مرض میں مبتلا ہوا تو ذوالفقار علی بھٹو نے اُسے لندن کے ہائی کمیشن میں کچھ سفارتی ذمہ داریاں سونپ دیں تاکہ اُسے وہاں بہتر طبی سہولتیں بھی میسّر ہو سکیں۔ یونیسکو کے افسر کی حیثیت سے سیاحت کا موقعہ مِلا تو اُسے بھی ضائع نہ ہونے دیا اور بہترین سفر نامے تحریر کیے۔ 1978ء میں اِبنِ انشاء کو حکومت پاکستان کی طرف سے پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اِبنِ انشاء کے سفرنامے 'آوارہ گرد کی ڈائری'، 'دُنیا گول ہے'، 'ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں'، 'چلتے ہو تو چین کو چلیے' اور 'نگری نگری پھرا مسافر' بہت مقبول ہوئے۔ اُس نے 'چاند نگر'، 'اُس بستی کے اِک کوچے میں' اور 'دلِ وحشی' جیسے شعری مجموعے بھی تخلیق کیے۔ اُس نے چینی نظموں کا اُردو ترجمہ بھی کیا۔

یہاں ہم شامل کر رہے ہیں ابن انشاء کی زندگی کے آخری ایّام کی نظم، 'جب عمر کی نقدی ختم ہوئی'۔

جب عمر کی نقدی ختم ہوئی

اب عمر کی نقدی ختم ہوئی
اب ہم کو ادھار کی حاجت ہے
ہے کوئی جو ساہو کار بنے
ہے کوئی جو دیون ہار بنے
کچھ سال، مہینے، دن لوگو
پر سود بیاج کے بن لوگو
ہاں اپنی جاں کے خزانے سے
ہاں عمر کے توشہ خانے سے
کیا کوئی بھی ساہو کار نہیں
کیا کوئی بھی دیون ہار نہیں
جب نام اُدھار کا آیا ہے
کیوں سب نے سر کو جھکایا ہے
کچھ کام ہمیں نپٹانے ہیں
جنھیں جاننے والے جانے ہیں
کچھ پیار دلار کے دھندے ہیں
کچھ جگ کے دوسرے پھندے ہیں
ہم مانگتے نہیں ہزار برس
دس پانچ برس، دو چار برس

ہاں، سود بیاج بھی دے لیں گے

ہاں اور خراج بھی دے لیں گے

آسان بنے، دُشوار بنے

پر کوئی تو دیون ہار بنے

تم کون، تمھارا نام ہے کیا

کچھ تم کو ہم سے کام ہے کیا

کیوں اِس مجمع میں آئی ہو

کچھ مانگتی ہو؟ کچھ لائی ہو

یہ کاروبار کی باتیں ہیں

یہ نقد ادھار کی باتیں ہیں

ہم بیٹھے ہیں کشکول لیے

سب عمر کی نقدی ختم کیے

گر شعر کے رشتے آئی ہو

تب سمجھو جلد جدائی ہو

اب گیت گیا سنگیت گیا

ہاں شعر کا موسم بیت گیا

اب پت جھڑ آئی پات گریں

کچھ صبح گریں کچھ رات گریں

یہ اپنے یار پرانے ہیں

اِک عمر سے ہم کو جانے ہیں

اِن سب کے پاس ہے مال بہت

ہاں عمر کے ماہ و سال بہت

ان سب کو ہم نے بلایا ہے

اور جھولی کو پھیلایا ہے

تم جاؤ ان سے بات کریں

ہم تم سے نا ملاقات کریں

کیا پانچ برس؟

کیا عمر اپنی کے پانچ برس؟

تم جان کی تھیلی لائی ہو؟

کیا پاگل ہو، سودائی ہو؟

جب عمر کا آخر آتا ہے

ہر دن صدیاں بن جاتا ہے

جینے کی ہوس ہی نرالی ہے

ہے کون جو اِس سے خالی ہے

کیا موت سے پہلے مرنا ہے

تم کو تو بہت کچھ کرنا ہے

پھر تم ہو ہماری کون بھلا

ہاں تم سے ہمارا رشتہ ہے

کیا سود بیاج کا لالچ ہے؟

کسی اور خراج کا لالچ ہے؟

تم سوہنی ہو، من موہنی ہو؛

تم جا کر پوری عمر جیو

یہ پانچ برس، یہ چار برس

چھن جائیں تو لگیں ہزار برس

سب دوست گئے، سب یار گئے

تھے جتنے ساہوکار، گئے

بس ایک یہ ناری بیٹھی ہے

یہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کیسی ہے؟

ہاں عمر ہمیں درکار بھی ہے

ہاں جینے سے ہمیں پیار بھی ہے

جب مانگیں جیون کی گھڑیاں

گستاخ اکھیں کِت جالڑیاں

ہم قرض تمھیں لوٹا دیں گے

کچھ اور بھی گھڑیاں لا دیں گے

جو ساعت و ماہ و سال نہیں

وہ گھڑیاں جن کو زوال نہیں

لو اپنے جی میں اتار لیا

اور ہم نے تم کو اُدھار لیا

☆☆☆☆☆

احمد فراز

پیدائش: 12۔جنوری، 1931ء .... کوہاٹ، پاکستان

وفات: 25۔اگست، 2008ء .... اسلام آباد، پاکستان

سید احمد شاہ، احمد فراز کا شمار اردو غزل کے نا قابلِ فراموش شعراء میں ہوتا ہے۔آپ نے اُردو اور فارسی میں ایم اے کے امتحانات پاس کیے۔آپ پروگریسو رائٹرز موومنٹ سے وابستہ رہے اور جبر و تعدّی کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔اردو ادب کے استاد رہے اور کچھ عرصہ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے سربراہ بھی رہے۔ 1993ء سے 2006ء تک نیشنل بک فاؤنڈیشن کی سربراہی کی لیکن ایک ٹی وی انٹرویو کی پاداش میں انھیں اس عہدہ سے فارغ کر دیا گیا۔

احمد فراز کی شاعری کے تراجم ہندی، روسی، جرمن، یوگوسلاوی اور پنجابی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔وہ ایک انتہائی باصلاحیت غزل گو شاعر تھے اور اُن کے چودہ مجموعے شائع ہو کر اُردو ادب کے قارئین سے پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔چند اشعار دیکھیے:

☆ ڈھونڈ اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

☆ ضبط لازم ہے مگر دُکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

احمد فراز نے نظمیں بھی لکھیں اور وہ غزل ہی کی طرح پسند کی گئیں۔ان کی نظموں میں 'مجھ سے پہلے'، 'اے میرے وطن کے خوش نواؤ'، 'بھلی سی ایک شکل تھی' اور 'اے مری ارضِ وطن' بہت مقبول ہوئیں۔آیئے پڑھتے ہیں:

بھلی سی ایک شکل تھی

بھلے دنوں کی بات ہے
بھلی سی ایک شکل تھی
نہ یہ کہ حُسن تام ہو
نہ دیکھنے میں عام سی
نہ یہ کہ وہ چلے تو کہکشاں سی رہ گزر لگے
مگر وہ ساتھ ہو تو پھر بھلا بھلا سفر لگے
کوئی بھی رُت ہو اس کی چھب
فضا کا رنگ روپ تھی
وہ گرمیوں کی چھاؤں تھی
وہ سردیوں کی دھوپ تھی
نہ مدتوں جدا رہے
نہ ساتھ صبح و شام ہو
نہ رشتۂ وفا پہ ضد
نہ یہ کہ اِذنِ عام ہو
نہ ایسی خوش لباسیاں
کہ سادگی گِلہ کرے
نہ اتنی بے تکلفی کہ آئینہ حیا کرے
نہ اختلاط میں وہ رم
کہ بدمزا ہوں خواہشیں

نہ اس قدر سپردگی
کہ زچ کریں نوازشیں
نہ عاشقی جنون کی
کہ زندگی عذاب ہو
نہ اس قدر کٹھور پن
کہ دوستی خراب ہو
کبھی تو بات بھی خفی
کبھی سکوت بھی سخن
کبھی تو کشتِ زعفراں
کبھی اُداسیوں کا بن
سُنا ہے ایک عمر ہے
معاملاتِ دل کی بھی
وصالِ جاں فزا تو کیا
فراقِ جاں گسل کی بھی
سو ایک روز کیا ہوا
وفا پہ بحث چھڑ گئی
میں عشق کو امر کہوں
وہ میری ضد سے چڑ گئی
میں عشق کا اسیر تھا
وہ عشق کو قفس کہے
کہ عمر بھر کے ساتھ کو

وہ بدتر از ہوس کہے
شجر حجر نہیں کہ ہم
ہمیشہ پا بہ گل رہیں
نہ ڈھور ہیں کہ رسیاں
گلے میں مستقل رہیں
محبتوں کی وسعتیں

ہمارے دست و پا میں ہیں
بس ایک در سے نسبتیں
سگانِ باوفا میں ہیں
میں کوئی پینٹنگ نہیں
کہ اِک فریم میں رہوں
وہی جو من کا میت ہو
اسی کے پریم میں رہوں
تمھاری سوچ جو بھی ہو
میں اِس مزاج کی نہیں
مجھے وفا سے بَیر ہے
یہ بات آج کی نہیں
نہ اُس کو مجھ پہ مان تھا
نہ مجھ کو اُس پہ زعم ہی
جو عہد ہی کوئی نہ ہو
تو کیا غمِ شکستگی

سو اپنا اپنا راستہ
ہنسی خوشی بدل دیا
وہ اپنی راہ چل پڑی
میں اپنی راہ چل دیا
بھلی سی ایک شکل تھی
بھلی سی اُس کی دوستی
اب اُس کی یاد رات دن
نہیں، مگر کبھی کبھی

☆☆☆☆☆

اے مِری ارضِ وطن

اے مری ارضِ وطن ، پھر تِری دہلیز پہ میں
یوں نگوں سار کھڑا ہوں کوئی مجرم جیسے
آنکھ بے اشک ہے برسے ہوئے بادل کی طرح
ذہن بے رنگ ہے اُجڑا ہو موسم جیسے
سانس لیتے ہوئے اِس طرح لرز جاتا ہوں
اپنے ہی ظلم سے کانپ اُٹھتا ہے ظالم جیسے

☆☆☆☆

تو نے بخشا تھا مِرے فن کو وہ اعجاز کہ جو
سنگِ خارا کو دھڑکنے کی ادا دیتا ہے
تو نے وہ سحر مِرے حرفِ نوا کو بخشا
جو دلِ قطرہ میں قلزم کو چھپا دیتا ہے
تو نے وہ شعلۂ اِدراک دیا تھا مجھ کو
جو کفِ خاک کو انسان بنا دیتا ہے

☆☆☆☆

اور میں مستِ مئے رامش و رنگِ ہستی
اِتنا بے حس تھا کہ جیسے کسی قاتل کا ضمیر
یہ قلم تیری امانت تھا مگر کس کو ملا
جو لُٹا دیتا ہے نشّے میں سلف کی جاگیر
جیسے میزانِ عدالت کسی کج فہم کے پاس
جیسے دیوانے کے ہاتھوں میں برہنہ شمشیر

☆☆☆☆

تجھ پہ ظلمات کی گھنگھور گھٹا چھائی تھی
اور میں چپ تھا کہ روشن ہے مِرے گھر کا چراغ
تیرے مے خانے پہ کیا کیا نہ قیامت ٹوٹی
اور میں خوش تھا سلامت ہے ابھی میرا ایاغ
میں نے اپنے ہی گنہگار بدن کو چوما
گرچہ جویائے محبت تھے ترے جسم کے داغ

☆☆☆☆

حجلۂ ذات میں آئینے جڑے تھے اتنے
کہ میں مجبور تھا گر محوِ خود آرائی تھا
تیری روتی ہوئی مٹی پہ نظر کیا جمتی
کہ میں ہنستے ہوئے جلووں کا تمنائی تھا
ایک پل آنکھ اُٹھائی بھی اگر تیری طرف
میں بھی اوروں کی طرح صرف تماشائی تھا

☆☆☆☆

آج سے میرا ہُنر پھر سے اثاثہ ہے ترا
اپنے افکار کی نس نس میں اتاروں گا تجھے
وہ بھی شاعر تھا کہ جس نے تجھے تخلیق کیا
میں بھی شاعر ہوں تو خوں دے کے سنواروں گا تجھے
اے مِری ارضِ وطن اے مری جاں اے مرے فن
جب تلک تابِ تکلم ہے پکاروں گا تجھے

☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

پیدائش: 20۔نومبر،1916ء ...... انگہ،خوشاب، پاکستان

وفات: 10۔جولائی،2006 ء .... لاہور، پاکستان

شاعر، افسانہ نگار، ادیب اور صحافی احمد شاہ اعوان، احمد ندیم قاسمی ایک عہد ساز شخصیت تھے۔افسانہ اور شاعری میں شہرت پائی۔ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی بِناء پر قیدو بند کی صعوبت بھی برداشت کی۔1923ء میں اپنے والد پیر غلام نبی کی وفات کے بعد اپنے چچا حیدر شاہ کے پاس اٹک چلے گئے تاہم اُنھوں نے میٹرک کا امتحان 1931ء میں گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ سے پاس کیا اور بی اے صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے کیا۔تلاشِ معاش کے سلسلے میں بھی اسی طرح نگر نگر پھرے لیکن مستقل مسکن لاہور کو ہی بنایا۔ریفارمز کمیشن، ایکسائز اور ریڈیو پاکستان کی ملازمت کی لیکن بالآخر قلم کتاب کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔

قاسمی صاحب کی شاعری کی ابتداء 1931ء میں شیخوپورہ میں قیام کے دوران ہوئی جب مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر اُن کی نظم روزنامہ 'سیاست' لاہور کے سرورق پر شائع ہوئی۔ازاں بعد کالم نگاری بھی کی۔دو بار 'امروز' اور 'نقوش' کے مدیر رہے اور پھر 'فنون' کے ہو کر رہ گئے۔

آپ کم وبیش پچاس (50) کتب کے خالق ہیں۔

اِس مجموعے کے لیے ہم نے اُن کی دو نظموں کا انتخاب کیا ہے۔

ایک درخواست

زندگی کے جتنے دروازے ہیں
مجھ پر بند ہیں
دیکھنا، حدِ نظر سے آگے بڑھ کر دیکھنا بھی جرم ہے
سوچنا، اپنے عقیدوں اور یقینوں سے نکل کر سوچنا بھی جرم ہے
آسماں در آسماں
اسرار کی پرتیں ہٹا کر جھانکنا بھی جرم ہے
'کیوں' بھی کہنا جرم ہے
'کیسے' بھی کہنا جرم ہے
سانس لینے کی تو آزادی میسّر ہے مگر
زندہ رہنے کے لیے کچھ اور بھی درکار ہے
اور اس ''کچھ اور'' کا تذکرہ بھی جرم ہے
اے ہنر مندانِ سیاست و آئین!
اے خداوندانِ ایوانِ عقائد!
زندگی کے نام پر بس اِک عنایت چاہیے
مجھے اِن سارے جرائم کی اجازت چاہیے

☆☆☆☆☆

مغویہ

رات خاموش ہے
سر برآوردہ اشجار دِن بھر کے رقصِ مسلسل سے
تھک ہار کے
بازوؤں کو سمیٹے
اندھیرے کے بستر پر خوابیدہ ہیں
سرد جھونکے خراماں ہیں
لیکن کوئی چاپ اُٹھتی نہیں
جیسے شاہی کنیزیں جو ملبوس کے
نقرئی ہاتھوں کو سنبھالے ہوئے
کانچ کے فرش پر چل رہی ہیں
ستاروں کی آنکھوں میں نیندیں ہیں
رفتار میں ایک ایسا بہاؤ ہے
جیسے فضا سے اُترتے ہوئے برف کے نرم گالے
پُراسرار
آواز سے بے نیاز
اوّلیں عشق کی دھیمی سرگوشیوں کی طرح
رات خاموش ہے
جیسے اپنے ہی بالوں میں لپٹی ہوئی

سانولی سی دُلہن
جس کے ماتھے کی افشاں پہ
گالوں کے غازے پہ
ہاتھوں کی مہندی پہ
سینے کے اُمڈے ہوئے عزمِ تخلیق پر
اُس کے اپنے ہی پیکر کی خوشبو نے
وہ دائرے بُن دیئے ہیں
جو چھونے سے کُھل جائیں گے

رات خاموش ہے
رات کی خاموشی کتنی گہری ہے
کس درجہ گمبھیر ہے
کس میں ہمت ہے جو زور کی سانس تک لے سکے
رات کے اِس وقار اور پندار کو
ٹھیس پہنچا سکے
کس قدر تن تنے، کتنی پیاری رعونت سے
لبریز ہے
رات کی خامُشی
رات کی خامشی کتنی گہری ہے
کس درجہ گمبھیر ہے
رات خاموش ہے
ایک چیخ آسماں سے زمیں تک خراشیں اُگاتی ہوئی
چار جانب لپکتی چلی جا رہی ہے

ہوا کا بہاؤ اُلجھنے لگا ہے

ستارے لرزنے لگے ہیں

خود اپنے ہی بالوں میں لپٹی ہوئی سانولی سی دُلہن

ٹوٹتی نیند کی ڈوریاں پلکوں سے چُنتی ہوئی

چونک اُٹھتی ہے

خموشی کی گمبھیرتا کا بھرم کُھل گیا ہے

وقار اور پندار کے آئینوں کی کئی کرچیاں

ہر طرف منتشر ہیں

یہ آواز کس کی تھی؟

یہ کون تھا؟

جس کی دہشت نے طوفاں اُٹھایا ہے

قدرت کے ایک شعر کی جس نے تضحیک کی ہے

نہ جانے یہ گستاخ آواز کس کی تھی؟

یہ کون تھا؟

رات کی خامشی پھڑ پھڑانے لگی ہے

شبوں کے ورق چیختے اور بجتے ہوئے ہر طرف اُڑ رہے ہیں

یہ راتیں یہ دن

اور یہ شامیں یہ صبحیں

گھٹائیں اُمڈتی ہوئی اور چھٹتی ہوئی

بجلیاں جل رہی ہیں، بجھ رہی ہیں

کڑک ہے

چمک ہے

ورق اُڑ رہے ہیں

ورق تھم گئے ہیں

سکوت، ایک گمبھیر گہرا سکوت

ایک پُراسرار سنّاٹا

ایک بار پھر رات خاموش ہے

رات کی خاموشی میں

بہت دور سے

نیند میں چُور اِک آواز آنے لگی ہے

اس آواز میں رات کی خامشی کا شکستہ وقار

ایک ٹوٹا ہوا تن تنا

زخم خوردہ سی خود اعتمادی

پُکار

احتجاج

اور جانے کہاں کا تأثر ہے

آواز آنے لگی ہے

تم نہیں جانتے

تم جو ناموس و عصمت کی چھاتی میں آزادیوں کے علَم

گاڑتے ہو

مجھے تم نہیں جان سکتے

سیاست کے بازار کی جنس کو کون پہچان پائے

کِسے دھیان آئے

کہ میں کون ہوں

قوم کے چند برخود غلط راہنما

میری تقدیس کو بیچ کر

اِک نئی جنگ

اِک تازہ سوداگری کے لیے

پھر سے تیاریاں کر رہے ہیں

میں اِس شور میں آج کس کو پکاروں

بتاؤ کسے؟

کس کو آواز دوں

کس سے یہ راز کہہ دوں

کہ میں مذہب و نسل کے چند رنگین عیاروں کے بدلے میں

بیچی ہوئی

ایک عورت ہوں

بیٹی ہوں ماں ہوں

بہن ہوں

میں ایک مغویہ ہوں

☆☆☆☆☆

اختر الایمان

پیدائش: 12۔نومبر،1915ء ...... بجنور،اُتر پردیش،انڈیا

وفات: 3۔مارچ،1996ء .... ممبئی،انڈیا

راؤ فتح محمد، اختر الایمان جدید نظم کے مایہ ناز شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم بجنور سے اور بی اے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔شعراء کی کثرت کے برعکس اختر الایمان نے ابتداء میں ہی غزل پر نظم کو ترجیح دی اور ایک کامیاب نظم نگار کے طور پر مانے گئے۔فلم کی طرف آئے تو نغمہ نگاری پر مکالمہ نگاری کو ترجیح دی اور اسی شعبہ میں 1963ء میں فلم 'دھرم پُتر' اور 1966ء میں فلم 'وقت' پر فلم فیئر اعزاز حاصل کیا۔

شعری مجموعے '' یادیں' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ اُن کا دوسرا مجموعہ 'زمستان سرد مہری کا' اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔اُن کی نظمیں 'ایک لڑکا'، 'نیا آہنگ'، 'تجدید'، 'یادیں' 'نقشِ پا'، 'وہ مکان' اور 'موت' بہت مقبول ہوئیں۔ زیرِ نظر انتخاب میں 'موت'، 'ایک لڑکا' اور 'نیا آہنگ' کے لیے جگہ بنتی ہے۔

42

ایک لڑکا

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم جھٹپٹے کے وقت راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم ، تتلیوں کی سُونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں جلتی ریت یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے ، مدرسوں سے ، خانقاہوں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ ساں ، کبھی جوں چشمِ خوں بستہ
ہوا میں تیرتا خوابوں میں بادل کی طرح اُڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا ، مڑتا
مجھے اِک لڑکا ، آوارہ منش ، آزاد سیلانی
مجھے اِک لڑکا ، جیسے تُند چشموں کا ، رواں پانی
نظر آتا ہے ، یوں لگتا ہے ، جیسے یہ بلائے جاں
مِرا ہمزاد ہے ، ہر گام پر ، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں ، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے ، جیسے میں مفرور ملزم ہوں

یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترؔ الایمان تم ہی ہو؟
خدائے عز و جل کی نعمتوں کا مُعترف ہوں میںا
مجھے اقرار ہے اُس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بسترِ کم خواب ہو ، دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمۂ افلاک کا سایا
اُسی کی بخششیں ہیں ، اُس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا اِک حدِ فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے خاکِ اسفل سے
مِری تخلیق کی ، مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں مونگوں سے ، کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کُن خوشبوؤں سے معمور کر دی ہیں
وہ حاکم قادرِ مطلق ہے ، یکتا اور اعلیٰ ہے
اندھیرے کو اُجالے سے جدا کرتا ہے ، خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں اُس کی رحمت اور سخاوت ہے
اُسی نے خسروی دی ہے لئیموں کو ، مجھے نکبت
اُسی نے یاوہ گویوں کو مِرا خازن بنایا ہے
تونگر ہرزہ کاروں کو کیا ، دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترؔ الایمان تم ہی ہو؟

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے ، میرے قبضے میں
جز اِک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں ، پھر بھی ، مگر مجھ کو
خروشِ عمر کے اِتمام تک اِک بار اُٹھانا ہے

عناصر منتشر ہو جانے نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ تو گانا ہے
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ ان کا کہہ کر مسکرانا ہے
وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے کھوٹے سکے کی طرح سب کو دکھانا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تُو اِک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
غرض گرداں ہوں بادِ صبح گاہی کی طرح لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج ، اندوہ پرور ، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں!
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اِک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے ، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے ، جھوٹ ہے ، دیکھو میں زندہ ہوں!

☆☆☆☆☆

موت

کون آوارہ ہواؤں کا سبک بار ہجوم
آہ! احساس کی زنجیرِ گراں ٹوٹ گئی
اور سرمایۂ انفاس پریشاں نہ رہا
میرے سینے میں اُلجھنے لگی فریاد مِری
زنگ آلود محبت کو تجھے سونپ دیا
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
ٹمٹماتا ہے مِرے ساتھ نگاہوں کا چراغ

اِس قدر ہوش سے بے گانہ ہوئے جاتے ہو
تم چلی آؤ یہ دیوار پہ کیا ہے رقصاں
میرے اجداد کی اٹکی ہوئی روحیں تو نہیں
پھر نگاہوں میں اُمڈ آیا ہے تاریک دھواں
ٹمٹماتا ہے مِرے ساتھ یہ معصوم چراغ
آج ملتا نہیں افسوس پتنگوں کا نشاں
میرے سینے میں اُلجھنے لگی فریاد مِری
ٹوٹ کر رہ گئی انفاس کی زنجیرِ گراں

توڑ ڈالے گا یہ کم بخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اُسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا
جی اُلجھتا ہے مِری جان پہ بن جائے گی
تھم گیا آج شکاری کی کماں ٹوٹ گئی

لوٹ آیا ہوں بہت دور سے خالی ہاتھوں
آج امید کا دن بیت گیا شام ہوئی
زندگی آہ یہ موہوم تمنا کا مزار
میں نے چاہا بھی مگر تم سے محبت نہ ہوئی

کہہ چکے اب تو خدا کے لیے خاموش رہو
ایک موہوم سی خواہش تھی فلک چھونے کی
زنگ آلود محبت کو تجھے سونپ دیا
سرد ہاتھوں سے مِری جان مِرے ہونٹ نہ سی

گر کبھی لوٹ کے آ جائے وہی سانولی رات
خشک آنکھوں میں جھلک آئے نہ بے سود نمی
زمزمہ اُف یہ بلا کا یہ مسلسل دستک
بے اماں رات کبھی ختم بھی ہو گی کہ نہیں

اُف یہ تاریک فضاؤں کا الم ناک سکوت
میرے سینے میں دبی جاتی ہے آواز مِری
تیرگی اُف یہ دھندلکا میرے نزدیک نہ آ
یہ مِرے ہاتھ پہ جلتی ہوئی کیا چیز گری

آج اِس اشکِ ندامت کا کوئی مول نہیں
آہ احساس کی زنجیرِ گراں ٹوٹ گئی

اور یہ میری محبت بھی تجھے جو ہے عزیز
کل یہ ماضی کے گھنے بوجھ میں دب جائے گی
کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو
کیا خبر وقت دبے پاؤں چلا آیا ہو

زلزلہ اُف یہ دھماکہ یہ مسلسل دستک
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
اُف یہ تاریک فضاؤں کا الم ناک سکوت
کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو

توڑ ڈالے گا یہ کم بخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا

☆☆☆☆☆

اختر شیرانی

پیدائش: 4۔مئی،1905ء ...... ٹونک،راجھستان،انڈیا

وفات: 9۔ستمبر،1948 ء .... لاہور، پاکستان

محمد داؤدخاں،اختر شیرانی کے والد حافظ محمود اختر خاں شیرانی اورینٹل کالج لاہور میں فارسی کے معلّم تھے۔اختر کی بھی ساری زندگی لاہور ہی میں گزری۔اگرچہ والدِ محترم بہترین محقق اور زبان داں تھے اور اقبال اور حفیظ جالندھری کی صف کی شخصیت تھے لیکن اختر اپنے مزاج اور روّیے کے لحاظ سے یکسر مختلف تھا۔وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرسکا اور ابتدائی زندگی میں ہی شعروشاعری کو مستقل مشغلہ بنالیا۔اختر نے 'شہکار'، 'ہمایوں' اور 'سہیلی' کی ادارت کی۔پھر 'انقلاب' 'خیالستان' اور 'رومان' کے نام سے پرچے جاری کیے۔وہ پہلا شاعر ہے جس نے اردو شاعری میں 'عورت' سے براہِ راست خطاب کیا۔

اختر کو اللہ نے دو بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کیں۔اُن کے ایک بیٹے پروفیسر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے دادا کی طرح نام کمایا۔زندگی کا بڑا حصہ گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں گزارا اور شیخوپورہ کو ہی اپنا مستقل مسکن بنایا۔آپ ادبی تحقیق کا ایک انتہائی معتبر نام تھے جو 2020ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

اختر شیرانی عہدِ جوانی میں ہی صرف 43 برس کی عمر پا کر چل دیا اور میانی صاحب میں دفن ہوا۔

اعترافِ محبت

لو آؤ کہ رازِ پنہاں کو رُسوائے حکایت کرتا ہوں
دامانِ زبانِ خامُشی کو لبریز شکایت کرتا ہوں
گھبرا کے ہجومِ غم سے آج افشائے حقیقت کرتا ہوں
اظہار کی جرأت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

فکر آباد دنیا میں مِری ، اِک مسجودِ افکار ہو تم
شعرستانِ ہستی میں مِری ، اِک معبودِ اشعار ہو تم
اور میرے پرستش زارِ دل میں اِک بتِ شیریں کار ہو تم
میں جس کی عبادت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

مدت سے محبت کرتا تھا ، سو جان سے تم پر مرتا تھا
راتوں کو میں روتا رہتا تھا ، راتوں کو میں آہیں بھرتا تھا
ہاں راتوں کو آہیں بھرتا تھا ، پر تم سے کہتے ڈرتا تھا
آج اس کی جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

راتوں کو مِرے رونے کا سماں بیدار ستارے دیکھتے ہیں
اور میرے جنوں کے عالم کو ، عالم کے نظارے دیکھتے ہیں
باغوں کے مناظر دیکھتے ہیں ، نہروں کے کنارے دیکھتے ہیں

یوں شرحِ مصیبت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

حسرت بھری فریادوں کو مِری باغوں کی فضائیں جانتی ہیں
فریاد سے لبریز آہوں کو صحرا کی ہوائیں جانتی ہیں
اور میرے مچلتے آنسوؤں کو ساون کی گھٹائیں جانتی ہیں

اظہارِ حقیقت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

جس دن سے وہ صورت دیکھی ہے سو آرزوئیں بے تاب سی ہیں
دن ہیں تو وہ بے آرام سے ہیں ، راتیں ہیں تو وہ بے خواب سی ہیں
آنکھوں تلے ہر دم پھرتی ہیں وہ ''ساعدیں'' جو مہتاب سی ہیں

یاد اُن کی صباحت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

تم چاند سے بڑھ کر روشن ہو ، زہرہ کی قسم ، تاروں کی قسم
تم پھول سے بڑھ کر رنگیں ہو ، فطرت کے چمن زاروں کی قسم
تم سب سے حسیں ہو دُنیا کی ، دُنیا کے نظاروں کی قسم

دُنیا سے بھی نفرت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

اِس مکر کی دُنیا میں کہ جہاں معیارِ صداقت کچھ بھی نہیں
دو ''اشکوں'' سے بڑھ کر سچا اور اظہارِ محبت کچھ بھی نہیں
روتا ہوں تمھاری یاد میں گو رونے کی شہادت کچھ بھی نہیں
پیش اتنی شہادت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

جب رات کی بے کس تنہائی میں ، آپ کو تنہا پاتا ہوں
میں بربطِ دل سے سوز و گدازِ عشق کے نغمے گاتا ہوں
اتنا تو بتا دو تم بھی مجھے کیا میں بھی کبھی یاد آتا ہوں
بتلاؤ کہ منت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

گو تم سے مجھے نسبت نہیں کچھ ، اور ہے تو گدا و شاہ کی ہے
وہ ذرہ ہوں جس کے دل میں نہاں اُمید وصالِ ماہ کی ہے
اِک شاعرِ مفلس جس کو ہوس اِک قیصرۂ ذی جاہ کی ہے
پھر بھی یہ جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

گر حکم دو روشن تاروں کو میں لا کے جھکا دوں قدموں پر
جنت کے شگفتہ پھولوں کی جنت سی بسا دوں قدموں پر
سجدہ گہ مہر و ماہ کو بھی سجدے میں گرا دوں قدموں پر
ناچیز ہوں ہمت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

☆☆☆☆☆

ارشد نعیم

پیدائش: یکم جنوری، 1964ء ...... شیخوپورہ، پاکستان
ماشاءاللہ بقیدِ حیات ہیں اور شیخوپورہ میں ہی مقیم ہیں،

محمد ارشد، ارشد نعیم معروف نقاد اور شاعر ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ہی شعر و ادب میں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ تا دمِ تحریر محکمہ ڈاک میں بحیثیت اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر خدمات سر انجام دے کر 2022ء میں پی ایم جی آفس لاہور سے ملازمت سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ ارشد نعیم نظم اور غزل پر یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے 'رَختِ دل باندھ لو' اور 'اِک ستارہ اجنبی' زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ادبی لحاظ سے نہایت فعال ہیں۔ تنقید اور تحقیق پر ان کی کئی کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

پڑاؤ

اِک صدا کے تعاقب میں نکلے ہوئے
لڑکھڑاتی ہوئی ساعتوں میں رواں
قافلے رُک گئے
ڈگمگاتے قدم، مضمحل راہرو
اِک پڑاؤ پہ آ کر اکٹھے ہوئے
شام نزدیک تھی............
شام خاموشیوں میں پگھلنے لگی
وہ جو بکھرے ہوئے سارے اذہان تھے
داستانوں کی زنجیر میں بندھ گئے
داستاں گو جو صدیوں سے خاموش تھا
پھر نئی داستانیں سنانے لگا
زخم گنتی ہوئی
خواب چُنتی ہوئی
خون روتی ہوئی رات کٹنے لگی
مضمحل وقت کروٹ بدلنے لگا
راستہ اِک نئی سمت بڑھنے لگا

☆☆☆☆☆

اشرف نقوی

پیدائش: 6 ۔مئی،1962ء ...... شیخوپورہ، پاکستان
ماشاءاللہ بقیدِ حیات ہیں اور شیخوپورہ میں مقیم ہیں

اشرف نقوی کا اصل نام سید محمد اشرف ہے۔حافظِ قرآن ہیں۔ میٹرک کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پاس کیا۔ازاں بعد گورنمنٹ کامرس کالج شیخوپورہ اور گورنمنٹ ڈگری کالج شیخوپورہ میں زیرِ تعلیم رہے۔محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے اور بطور ایس ایس ٹی 2022ء میں ریٹائر ہوئے۔غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی لیکن رجحان غزل کی طرف زیادہ ہے۔ان کے دو شعری مجموعے 'آخرش' 2006ء میں اور 'زادِ حرف' 2015ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ جنھیں ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔''آخرش'' پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی نے لکھا:''اشرف نقوی کی شاعری پڑھتے ہوئے پہلے تو آپ چونکتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مسحور ہوتے چلے جاتے ہیں۔اس کا روایتی ڈکشن پس منظر میں رہتا ہے اور اِس کا جدید طرزِ احساس اس کے جذبے اور خلوص کے ساتھ آمیز ہو کر قاری کے دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ وہ محبت کی شاعری بھی کرتا ہے تو یوں کہ محبت کی شاعری کرنے والوں میں نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔'' امجد اسلام امجد اشرف نقوی کی شاعری کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ ''موضوعات کا انتخاب، فکری تازگی، فنی گرفت، اظہار کی قوت اور بے ساختگی اور ردیفوں کا ماہرانہ استعمال ایسا ہے کہ قاری اسے پڑھ کر چونکتا بھی ہے اور ایک ایسی جذباتی آسودگی بھی محسوس کرتا ہے جو کسی بھی اچھے فن پارے کے اندر خون کی طرح گردش کرتی رہتی ہے۔'' اشرف نقوی کی ادبی خدمات' کے عنوان سے سرگودھا یونیورسٹی سے اور 'اشرف نقوی، حیات اور ادبی خدمات' کے زیرِ عنوان علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کے مقالے تحریر کیے جا چکے ہیں۔

یہ لوگ میرے

یہ شہر میرا، یہ لوگ میرے
نہ جانے کیسی خزاں رُتوں کے ڈسے ہوئے ہیں
یہ شہر میرا کہ جس میں ہر سُو
گلاب چہرے کھلے ہوئے تھے
گھروں سے گھر کیا، دلوں سے دل بھی ملے ہوئے تھے
یہ لوگ میرے کہ جو ہمیشہ
محبتوں کے امین ٹھہرے
جو صاحبانِ یقین ٹھہرے
دل و نظر کے حسین ٹھہرے
پھر ایک ظالم ہوا نے سارا نظامِ گلشن کچھ ایسا بدلا.................
کہ اب جدا ہیں دِلوں سے دل بھی
گھروں سے گھر بھی جدا جدا ہیں
یہ لوگ میرے
محبتوں کے امیں نہیں ہیں
دل و نظر کے حسیں نہیں ہیں
یہ صاحبانِ یقیں نہیں ہیں
یہ شہر بھی اب مِرا نہیں ہے
یہ لوگ بھی اب مِرے نہیں ہیں

☆☆☆☆☆

میری حقیقت

مِرا وجود ہے صحرا میں ریت کا ٹیلہ
کسی بھی پل، کسی لمحے جسے قرار نہیں
ہوائے تیز کے چلتے ہی خوف کے ہاتھوں
عجیب وحشت ورقصِ جنوں کی حالت میں
سفر میں رہتا ہے
اِک دشتِ رائیگانی کے
اور اُس کے بعد بگولوں کی شکل میں ڈھل کر
یہ بات کرتا ہے پل بھر میں آسمانوں سے
مگر .... جب آندھی
ذرا دیر کو ٹھہرتی ہے
غبارِ وقت بھی آخر کو بیٹھ جاتا ہے
تو ہوتا یوں ہے ....
یہ اپنی جگہ نہیں ہوتا
تلاش اِس کو کریں
لاکھ ڈھونڈنے والے
جہان بھر میں یہ لیکن
کہیں نہیں ہوتا

☆☆☆☆☆

افتخار عارف

پیدائش: 21۔مارچ، 1944ء ...... لکھنؤ، انڈیا

بقیدِ حیات ہیں اور اسلام آباد میں مقیم ہیں۔

افتخار عارف نے اپنی جنم دھرتی لکھنؤ یونیورسٹی سے 1965ء میں ایم اے کیا اور پھر جرنلزم کی تعلیم کے لیے نیویارک چلے گئے۔ پاکستان ہجرت کے بعد بحیثیت نیوز کاسٹر ریڈیو سے منسلک ہوئے۔ ٹیلی ویژن آنے کے بعد پاکستان ٹیلی ویژن جوائن کیا اور عبید اللہ بیگ کے ساتھ مل کر شہرہ آفاق معلوماتی پروگرام 'کسوٹی' چلایا۔ ازاں بعد انگلینڈ چلے گئے۔

افتخار عارف پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے بھی سربراہ رہے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے ہلالِ امتیاز، ستارہ امتیاز اور صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی حاصل کیا۔ اُن کے شعری مجموعے 'مہرِ دونیم'، 'حرفِ باریاب'، 'جہانِ معلوم' اور کتابِ دل و دُنیا کے نام سے شائع ہوئے۔ اُنھوں نے سادہ اور عام فہم زبان میں نہایت دل کش نظمیں تخلیق کیں جن میں 'بارہواں کھلاڑی'، 'ایک اداس شام کے نام'، 'ایک سوال'، 'اور ہوا چپ رہی' اور اسکینڈل' بہت مقبول ہوئیں۔

ایک سوال

میرے آباؤ اجداد نے حرمتِ آدمی کے لیے
تا ابد روشنی کے لیے
کلمۂ حق کہا
مقتلوں، قید خانوں، صلیبوں میں بہتا لہو اُن کے ہونے کا اعلان کرتا رہا
وہ لہو حُرمتِ آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا
اور میں پا برہنہ سرِ کوچۂ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی
سوچتا رہ گیا
جسم میں میرے ان کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں؟

☆☆☆☆☆

اور ہوا چپ رہی

شاخِ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے اتنے بسیرے اُجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کی تگ وتاز پر
بین کرتی رہیں
اور ہوا چپ رہی
زرد پرچم اُڑاتا ہوا لشکرِ بے اماں گل زمینوں کو پامال کرتا رہا
اور ہوا چپ رہی
آرزومند آنکھیں بشارت طلب دل دعاؤں کو اُٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر رہ گئے
اور ہوا چپ رہی
اور تب حبس کے قہرماں موسموں کے عذاب ان زمینوں پہ بھیجے گئے
اور منادی کرادی گئی
جب کبھی رنگ کی خوشبوؤں کی اُڑانوں کی آواز کی اور خوابوں کی توہین کی جائے گی
یہ عذاب ان زمینوں پہ آتے رہیں گے

☆☆☆☆☆

اسکینڈل

اب کے جب آئے تو اِس طرح سے آئے مرا دوست
جس طرح شام کے اخبار میں خبریں آئیں

شہر کا شہر سنبھالے ہوئے پتھر نکلے
ہر نئے جرم کا الزام مِرے سر نکلے

اور پھر جرمِ محبت کی پذیرائی ہو!
جشن کا جشن ہو رسوائی کی رسوائی ہو!

☆☆☆☆☆

امجد اسلام امجد

پیدائش: 4۔اگست، 1944ء ...... لاہور، پاکستان

وفات: 10۔فروری، 2023ء ....لاہور، پاکستان

افسانہ نگار، کالم نگار، شاعر، ڈرامہ نگار اور نغمہ نگار امجد اسلام امجد انتہائی با صلاحیت تخلیق کار ہیں۔ ایم اے اُردو کے بعد اُردو ادبیات کے کے استاد مقرر ہوئے اور 1968ء تا 1975ء ایم اے او کالج لاہور سے منسلک رہے۔ درس و تدریس کے ساتھ شعر و ادب کی تخلیق پر بھی پوری توجہ دی۔ حمد و نعت، غزل و نظم، افسانہ و ڈرامہ، کچھ بھی ان کے نوکِ قلم سے دور نہ رہا۔ اُنھوں نے اپنی تخلیقات پر گریجویٹ ایوارڈ، ستارہ امتیاز اور پرائیڈ آف پرفارمنس کے اعزازات حاصل کیے۔ ٹی وی ڈرامہ 'وارث' نے انھیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا۔

امجد اسلام امجد کے بہت سے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں شعر اور تنقید کے مخصوص قارئین کے علاوہ عام قارئین کی دلچسپی کا سامان بھی موجود ہوتا ہے۔ اگر امجد کو عوام کا تخلیق کار اور عوام کا فن کار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انداز دیکھیے:

☆ حیرت سے سارے لفظ اُسے دیکھتے رہے
باتوں میں اپنی بات کو کیسا بدل گیا

☆ تیرے سوا کسی اور کو سوچا بھی نہیں
تم کو معلوم بھی شاید کبھی ہو کہ نہ ہو

اِس مجموعے کے لیے ہم نے امجد کی نظم 'یہ جو سانپ سیڑھی کا کھیل ہے' اور 'محبت کی ایک نظم' منتخب کی ہیں۔

یہ جو سانپ سیڑھی کا کھیل ہے

یہ جو سانپ سیڑھی کا کھیل ہے
ابھی ساتھ تھے دونوں ہم نوا
وہ بھی ایک پہ
میں بھی ایک پہ
اُسے سیڑھی ملی وہ چڑھ گیا
مجھے راستے میں ہی ڈس لیا
میرے بخت کے کسی سانپ نے
بڑی دور سے پڑا لوٹنا
زخم کھا کے اپنے نصیب کا
وہ ننانوے پہ پہنچ گیا
میں دس کے پھیر میں گھر گیا
اُسے ایک نمبر تھا چاہیے
جو نہیں ملا سو نہیں ملا

میں بڑھا تو بڑھتا چلا گیا

بس ایک چوکے کی بات تھی

اور اس سے جیتنا میری مات تھی

میں نے جان کے گوٹ غلط چلی

اور سانپ کے منہ میں ڈال دی

یہ جو پیار ہے۔۔۔۔۔

کبھی سوچنا۔۔۔۔۔

یہ بھی سانپ۔۔۔۔۔سیڑھی کا کھیل ہے!!

☆☆☆☆☆

محبت کی ایک نظم

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاندراتوں کی نرم دل گیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا
اگر وہ نخلِ فلک سے اُڑ کر
تمھارے قدموں میں آ گرے تو
یہ جان لینا وہ استعارہ تھا میرے دل کا
اگر نہ آئے
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے
کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو
تو اس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے
اگر کبھی میری یاد آئے
گریز کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
میں خوشبوؤں میں تمھیں ملوں گا
مجھے گلابوں کی پتیوں میں تلاش کرنا
میں اوس قطروں کے آئینوں میں تمھیں ملوں گا
اگر ستاروں میں اور قطروں میں خوشبوؤں میں نہ پاؤ مجھ کو

تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمھیں ملوں گا

کہیں پہ روشن چراغ دیکھو

تو جان لینا کہ ہر پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکا ہوں

تم اپنے ہاتھوں سے ان پتنگوں کی راکھ دریا میں ڈال دینا

میں خاک بن کر سمندروں میں سفر کروں گا

کسی نہ دیکھے ہوئے جزیرے پہ

رک کے تم کو صدائیں دوں گا

سمندروں کے سفر پہ نکلو

تو اس جزیرے پہ بھی اُترنا

☆☆☆☆☆

ایوب خاور

پیدائش:12۔جون،1948ء ...... چکوال، پاکستان

لاہور میں مقیم ہیں اور بقید حیات ہیں۔

ایوب خاور کا تعلق چکوال کے ایک معروف فوجی خاندان سے ہے لیکن اُنھوں نے قلم کتاب کو ہی ذریعہ معاش بنایا۔شاعر، ڈرامہ نگار، ڈائریکٹر اور ٹی وی پروڈیوسر کی حیثیت سے اپنی صلاحیتیں منوانے میں کامیاب رہے۔شاعری پہلی ترجیح رہی لیکن شاید ان کی شاعری کو وہ توجہ نہیں ملی، جس کی یہ مستحق ہے۔اچھوتے خیالات اور منفرد لب ولہجہ ایوب خاور کو ہم عصر شعراء سے جدا کرتے ہیں۔ان کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ گلِ موسمِ خزاں

۲۔ تمھیں جانے کی جلدی تھی

۳۔ بہت کچھ کھو گیا ہے

ایوب خاور کے نغمات بھی نظموں سے کم نہیں ہیں۔چند ایک کا یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے:

سات سُروں کا بہتا دریا تیرے نام .... پرویز مہدی

اے چاند ہنس دو .... نصرت فتح علی خان

سردیوں کی شام جیسی روکھی پھیکی زندگی .... صنم ماروی

14۔اگست، 2013ء کو انھیں پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا گیا۔اُن کی نظمیں اُنھی کی نظر آتی ہیں کہ یہ مضامین ان کے اپنے ہیں۔آئیے پڑھتے ہیں:

بہت کچھ کھو گیا ہے

بہت کچھ کھو گیا ہے
اے شجر زادو!
مِری نس نس سے لپٹی دُھند میں
آخر بہت کچھ کھو گیا ہے، مِرا اِک اِک خواب پلکوں کی
سلاخوں سے اُلجھ کر جانے کس صحرا کا پانی ہو گیا ہے
اے شجر زادو!
جسے کردار جنگل کے کسی گمنام رستے میں
اچانک چھوڑ جائے وہ کہانی ہو گیا ہے، اے زمیں زادو!
مِرے کچھ لفظ تھے، لفظوں کی گرہوں میں بندھے کچھ
پل تھے، ہر پل میں کئی صدیاں، کئی صدیوں کے ماہ وسال،
دن، راتیں، دوپہریں، صُبحیں، شامیں اور اِن شاموں کے ماتھے پر
سجے کچھ چاند، تارے، رت جگے اور رت جگوں کے نیلمیں جھرنوں کی
جھر جھر میں کسی پائل کی چھن چھن اور اس چھن چھن کی جھلمل میں
کسی بے ساختہ، بے خود ہنسی کی نقرئی سرگم
کوئی سُنتا ہے!
کوئی ہے!!
زمیں زادو!
بہت کچھ کھو گیا ہے، میری آنکھیں

مِرا چہرہ اور مِرے ہونٹوں کی شبنم اور ہتھیلی کی لکیروں میں

مچلتے خشک دریا، انگلیوں کی گرم پوروں میں سلگتے لمس اور

پیروں کے تلووں سے لپٹتے راستوں کے خم

بہت کچھ کھو گیا ہے......

کیا بچا ہے!

خامشی کے سرمئی جنگل کی چُپ میں

ایک مقتل!

ایک مقتل!

جس کے بیچوں بیچ اِک بے نام لاش!

لاش کے چاروں طرف اِک گہری شام

شام بھی بدنام

خوں آشام

لاش کے کپڑوں کی ساری جیبیں خالی ہیں

ہوا کے ہاتھ میں اب تک

کوئی ایسی نشانی بھی نہیں آئی

کہ وہ جس کی مدد سے میرے جیسی اس بریدہ لاش کے وارث تلک پہنچے

ازل زادو!

بہت کچھ کھو گیا ہے

اصل میں میرا سبھی کچھ کھو گیا ہے

اے ابد زادو!

کوئی سنتا ہے!

کوئی ہے!!!

نہیں .... کوئی نہیں

تو اب لاوارثی کی گرد میں لپٹی ہوئی یہ میری لاش کون اُٹھائے؟

کس کے گھر جائے، صبازادو!

شجرزادو!!! ارے جنگل کے شہزادو!

ہوا کے ساتھ مل کر اِس کو کچھ اپنی طرح کا نام دو

اور پھر کچھ زرد، پیلے، سبز پتے جمع کر کے

اس کو اپنی طرح کا کوئی کفن دو اور ہوا کے ساتھ مل کر

ہاتھ اُٹھاؤ، سینہ پیٹو، بین ڈالو

اور مجھ بے نام کی لاوارثیت کا کرو ماتم

کرو ماتم!

کہ میرا دل نکالا جا چکا ہے

روح چوری ہو گئی ہے

لاش باقی رہ گئی ہے

اے عزازادو! کرو ماتم

ہوا کے ساتھ مل کر

شام کی بے چاند

خوں آشام، کالک سے لدی دیوار سے لگ کر

کرو ماتم

☆☆☆☆☆

اپنی موت پر

[1]

ہوائے شام چلنے کے لیے بے تاب ہے جاناں
بس اب یہ آخری ہچکی ہے
اپنے زانوؤں پر میرا سر رکھ لو، مِری آنکھوں کے اوپر اپنے
ہاتھوں سے ذرا اِن زرد پلکوں کے شکستہ شامیانے کو گرا دو
اور مِرے ماتھے پہ بوسہ دو
مِرے ماتھے پہ اُن ہونٹوں کا بوسہ دو
کہ جن کے لمس کی شبنم سے میرے ہر مشامِ جاں
میں کلیاں سی چٹکتی تھیں

مِرے اِن سرد ہاتھوں میں
تم اپنے گرم ہاتھوں کی شفق بھر دو
مِرے اِن برف ہونٹوں میں
ذرا سی دیر کو گل کار آنکھوں کی دھنک بھر دو
ہوائے شام چلنے کے لیے بے تاب ہے جاناں

[2]

گلِ ناخن کی نرمی سے مِرے سینے کو چیرا دو
اب اِس کھلتے ہوئے سینے کے اندر جھانک کر دیکھو
جہاں دل کے پیالے میں
بہت دن سے بہت سے دُکھ بچا کر میں نے رکھے ہیں

تم ان میں میرے تازہ خوابچوں کے
چند پتے ڈال کر کچھ دیر اپنی آتشِ رخسار پر رکھو
مجھے پھر غسل دو ایسے
کہ میرے منجمد چہرے پہ جتنی بھی تمھارے لمس کی گل کاریاں ہیں
اُن میں اپنی مرمریں پوروں کی حِدّت تک سمو ڈالو

[3]

چلو اب یوں کرو میرے کھلے سینے کو سی دو
ان چھوئے آنچل کے تاروں سے
ہوائے شام چلنے کے لیے بے تاب ہے
اور یہ تمھیں معلوم ہے میری تمھاری سُرمئی شامیں ہمیشہ
ایک انجانی اُداسی سے سخن کرتی رہی ہیں، آج تم مجھ کو اُسی
بے دام و بے مایہ اُداسی کا کفن دو جس کے ہر ہر تار پر اب تک
تمھارا نام لکھا ہے

[4]

ہوائے شام چلنے کے لیے بے تاب ہے جاناں
کفن کی ڈوریاں کس دو
مِرے چہرے کو کعبے کی طرف کر دو
بہت مصروف دُنیا کے بہت مصروف لوگوں سے کہو
آئیں، صفیں باندھیں، پڑھیں تکبیر، میرے خوابچے اور
ہاتھ اُٹھائیں آرزوئیں، سر جھکائیں میری نظموں کی
تمھارے حُسنِ بے اندازہ جیسی خوب رو سطریں

[5]

دُعائے مغفرت ہونے کو اب کچھ دیر باقی ہے
مِرے سینے پہ رکھی جانے والی سِل تراشی جا رہی ہے
آب و گِل میں میری ساری زندگی کے دن ملائے جا رہے ہیں
اِک دہشت ناک سنّاٹا ہے جس میں گورکن کے تیشۂ بدرنگ کی
آواز اور مصروف دُنیا کے بہت مصروف لوگوں کی پلٹ کر دُور
جاتی آہٹوں کی گونج شامل ہے

[6]

مِری میّت کو مٹی دینے والوں میں
مِرے کچھ خواب بچے، کچھ آرزوئیں اور کچھ نظموں کی سطریں رہ گئی ہیں
شام گہری ہونے والی ہے
کفن سرکا کے بس اب آخری بار
اِک ذرا اپنے لبِ نم ساز سے جاناں!
مِری میّت کے ماتھے اور آنکھوں اور ہونٹوں پر دوبارہ ایسے
لمحوں کے ستارے ٹانک دو جن کی کرامت روزِ محشر تک
لحد کے سرد اندھیروں میں مہکتی روشنی بھر دے

☆☆☆☆☆

بلراج کومل

پیدائش: 20۔ستمبر،1928 ء ...... سیالکوٹ، پاکستان

وفات: 25۔نومبر،2013ء .... دہلی، انڈیا

افسانہ نگار، شاعر اور نقاد بلراج کومل نے ابتدائی زندگی تو سیالکوٹ میں ہی گزاری لیکن بی اے کے لیے لاہور آ گئے۔ لاہور میں ہی ایم اے انگلش کا امتحان پاس کیا اور پھر انگریزی، اُردو، ہندی اور پنجابی لکھنے والوں سے روابط پیدا کیے۔ کومل نے اپنے تخلیقی جوہر کے لیے اُردو کا انتخاب کیا لیکن تقسیمِ ہند نے لاہور سے یہ جوہرِ قابل چھین لیا۔

دہلی میں تلاشِ معاش کے ساتھ ہی اُنھوں نے خوب صورت نظمیں تخلیق کرنا شروع کیں۔ اُن کی ہر نئی نظم زندگی کے تلخ تجربات کی عکّاسی کرتی تھی۔ اُن کی نظموں میں جنسی استحصال، رشتوں کا انہدام اور وجود کی تلاش استعارے کے پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔ اُن کے شعری مجموعے 'سفر مدام سفر'، 'لمبی بارش'، 'نژادِ سنگ'، 'پرندوں بھرا آسمان'، 'شہر میں ایک تحریر' اور 'رِشتۂ دل' بہت مقبول ہوئے۔ اُن کی مشہور نظمیں جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں اُن میں 'کاغذی پھول'، 'عالمِ گُل'، 'نو وارد کی دوکان'، 'ایمبولینس'، 'سرکس کا گھوڑا'، 'اکیلی'، 'چاپ'، 'سیمینار' اور 'یہ زرد بچّے' شامل ہیں۔

کومل کے افسانے 'آنکھیں اور پاؤں' کے نام سے شائع ہوئے جب کہ تنقید پر اُن کی کتاب 'ادب کی تلاش' کے عنوان سے چھپی۔ کومل نے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور پدم شری کا خطاب بھی حاصل کیا۔

اکیلی (تقسیمِ ہند کے بعد)

اجنبی اپنے قدموں کو روکو ذرا
جانتی ہوں تمھارے لیے غیر ہوں
پھر بھی ٹھہرو ذرا
سُنتے جاؤ اشکوں بھری داستاں
ساتھ لیتے چلو یہ مجسّم فغاں
آج دُنیا میں میرا کوئی بھی نہیں
میری امّی نہیں
میرے ابّا نہیں
میری آپا نہیں
میرے ننھے سے معصوم بھیّا نہیں
میری عصمت کی مغرور کرنیں نہیں
وہ گھروندا نہیں جس کے سائے تلے
لوریوں کے ترنّم کو سُنتی رہی
پھول چنتی رہی
گیت گاتی رہی
مسکراتی رہی
آج کچھ بھی نہیں
آج کچھ بھی نہیں
میری نظروں کے سہمے ہوئے آئینے

میری امّی کے، ابّا کے، آپا کے اور میرے ننھے سے معصوم بھیّا کے
خوں سے ہے دہشت زدہ
آج میری نگاہوں کی ویرانیاں چند مجروح یادوں سے آباد ہیں
آج میری اُمنگوں کے سوکھے کنول میرے اشکوں کے پانی سے شاداب ہیں
آج میری تڑپتی ہوئی سسکیاں ایک سازِ شکستہ کی فریاد ہیں
اور کچھ بھی نہیں
بھوک مٹتی نہیں
تن پہ کپڑا نہیں
آس معدوم ہے
آج دُنیا میں میرا کوئی بھی نہیں
آج دُنیا میں میرا کوئی بھی نہیں
اجنبی اپنے قدموں کو روکو ذرا
سُنتے جاؤ اشکوں بھری داستاں
ساتھ لیتے چلو یہ مجسّم فغاں
میری امّی بنو
میرے ابّا بنو
میرے ننھے سے معصوم بھیّا بنو
میری عصمت کی مغرور کرنیں بنو
میرے کچھ تو بنو
میرے کچھ تو بنو
میرے کچھ تو بنو

☆☆☆☆☆

یہ زرد بچے

گھروں کی رونق

یہ زرد بچے
پڑھیں لکھیں گے، جوان ہوں گے
معاش کی فکر، اِن کی قسمت

تلاشِ فردا-- حیات اِن کی
یہ رہ گزاروں پہ اپنے موہوم خواب لے کر پھرا کریں گے
یہ گھر بنائیں گے، شادیانے بجائیں گے، آنے والے رنگیں دِنوں کی خاطر
یہ چند لُقموں کی زندگی کا مآل سمجھیں گے، حسبِ دستور
عمر بھر ان کو انگلیوں پر گنا کریں گے

یہ میرا حصہ

یہ تیرا حصہ

پھر ایک دن
یہ بھی زرد بچوں کے باپ ہوں گے
اور اُن کی خاطر دُعا کریں گے
دراز ہو اِن کی عمر، دیکھیں یہ سو بہاریں

☆☆☆☆☆

سیمینار

سکونِ دل کی آرزو
کے رنگ صد ہزار تھے
ہجومِ حرف و گفتگو میں
ان کے نام، صرف ایک، دو یا تین
لب پہ جب نہ آ سکے
تو چشمِ نارسا کی کیا بساط تھی
کبھی وہ پھیل کر جلی
کبھی سمٹ کر منجمد سی ہو گئی

طلوع سے غروب تک
تمام لوگ منتظر رہے کہ غیب کے سیاہ بطن سے
وہ حادثہ
وہ طفلِ نو
ہُمکتا مسکراتا طفلِ نو
جنم ضرور لے گا
جس کے نور سے دمک اُٹھیں گے بام و در
سکون کے رنگ
ختم ہو گی حرف و گفتگو کی جنگ

کچھ اور تیز تر، شدید تر

زبان کی آتش وبال ہو گئی

گزرتی ساعتوں کے درمیاں

جلے ہوئے نشیمنوں کی خاک

کسی کے لیے، اگرچہ نرم تھی

نہ جانے کیوں نگاہِ ماہتاب اِتنی گرم تھی

فرازِ جام سے ابھی ابھی گری ہے شبنمِ سکوں

فرازِ جام سے ابھی ابھی اُٹھی ہے

نرم رو، صدائے مشک بار، بادِ رنگ و بو

جو لوگ محوِ خواب ہیں

حصارِ خواب کی حدوں سے تھوڑی دیر میں اُبھر کے آئیں گے

وہ نانِ آرزو، نئی سُہانی اور گرم دھوپ میں پکائیں گے

بدلتے موسموں کے ساتھ بار بار

حرف و گفتگو کی بزمِ سرگراں سجائیں گے

☆☆☆☆☆

پروین شاکر

پیدائش: 24۔نومبر،1952ء ...... کراچی، پاکستان

وفات: 26۔دسمبر،1994ء ...... اسلام آباد، پاکستان

پروین شاکر ایم اے انگلش تھیں اور انگریزی کی ہی معلّمہ رہیں۔ازاں بعد CBR میں چلی گئیں۔شاعری کے جراثیم ان کے بزرگوں بہار حسین آبادی اور نانا حسن عسکری سے وراثت میں ملے۔اُنھیں احمد ندیم قاسمی کی سرپرستی حاصل رہی اور اُن کا کلام 'فنون' میں باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔

پروین نسائی جذبات کی شاعرہ ہیں اور اُن کی کوئی ہم عصر شاعرہ پروین شاکر کا مقام اور اُن کی سی محبت اور احترام حاصل نہیں کر پائیں۔اُن کے چار مجموعے 'خوشبو'، 'صد برگ'، 'خود کلامی' اور 'انکار' شائع ہوئے جو طلسم کاری اور سادگی کا حسین امتزاج ہیں۔'خوشبو' اُس وقت اشاعت پذیر ہوا جب پروین شاکر کی عمر ابھی 24 / 23 برس کی تھی لیکن 'خوشبو' کی خوشبو نے اس تیزی سے ادبی ماحول کو معطّر کیا کہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔اُنھیں فیض انٹرنیشنل ایوارڈ اور پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا گیا۔

پروین کی ازدواجی زندگی سوسائٹی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی طرح بے چینی کا ہی شکار رہی۔اُنھوں نے علیحدگی اختیار کر لی اور اس کے بعد بھی پریشان ہی رہیں۔خیال ہے کہ وہ ٹریفک حادثہ جو اُن کی موت کا سبب بنا، اس کا سبب بھی اُن کی پریشان زندگی ہی تھی۔نمونۂ کلام دیکھیے:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی

وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

بس اتنا یاد ہے

دعا تو جانے کون سی تھی

ذہن میں نہیں

بس اتنا یاد ہے

کہ دو ہتھیلیاں ملی ہوئی تھیں

جن میں ایک میری تھی

اور اِک تمھاری!

☆☆☆☆☆

چاندرات

گئے برس کی عید کا دن کیا اچھا تھا
چاند کو دیکھ کے اُس کا چہرہ دیکھا تھا!
فضا میں کیٹس کے لہجے کی نرماہٹ تھی
موسم اپنے رنگ میں فیض کا مصرعہ تھا
دعا کے بے آواز ، اُلوہی لمحوں میں
وہ لمحہ بھی کتنا دلکش لمحہ تھا
ہاتھ اُٹھا کر جب آنکھوں ہی آنکھوں میں
اُس نے مجھ کو اپنے رب سے مانگا تھا
پھر میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر
کتنے پیار سے میرا ماتھا چوما تھا

ہوا! کچھ آج کی شب کا بھی احوال سنا
کیا وہ اپنی چھت پر آج اکیلا تھا؟
یا کوئی میرے جیسی ساتھ تھی ، اور اُس نے
چاند کو دیکھ کے اُس کا چہرہ دیکھا تھا!

☆☆☆☆☆

اِتنا معلوم ہے

اپنے بستر پہ بہت دیر سے میں نیم دراز
سوچتی تھی کہ وہ اِس وقت کہاں پر ہوگا
میں یہاں ہوں مگر اُس کوچۂ رنگ و بُو میں
روز کی طرح سے وہ آج بھی آیا ہوگا
اور جب اُس نے وہاں مجھ کو نہ پایا ہوگا

آپ کو علم ہے ، وہ آج نہیں آئی ہیں؟
میری ہر دوست سے اُس نے یہی پوچھا ہوگا
کیوں نہیں آئی وہ -- کیا بات ہوئی ہے آخر
خود سے اِس بات پہ سو بار وہ اُلجھا ہوگا
کل وہ آئے گی تو میں اُس سے نہیں بولوں گا
آپ ہی آپ کئی بار وہ روٹھا ہوگا
وہ نہیں ہے تو بلندی کا سفر کتنا کٹھن
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُس نے یہ سوچا ہوگا
راہ داری میں، ہرے لان میں، پھولوں کے قریب
اُس نے ہر سمت مجھے آن کے ڈھونڈا ہوگا

نام بھولے سے جو میرا کہیں آیا ہوگا

غیر محسوس طریقے سے وہ چونکا ہوگا
ایک جملے کو کئی بار سنایا ہوگا
بات کرتے ہوئے سو بار وہ بھولا ہوگا

یہ جو لڑکی نئی آئی ہے ، کہیں وہ تو نہیں
اُس نے ہر چہرہ یہی سوچ کے دیکھا ہوگا

جانِ محفل ہے ، مگر آج ، فقط میرے بغیر
ہائے کس درجہ وہی بزم میں تنہا ہوگا

کبھی سنّاٹوں سے وحشت جو ہوئی ہوگی اُسے
اُس نے بے ساختہ پھر مجھ کو پکارا ہوگا

چلتے چلتے کوئی مانوس سی آہٹ پا کر
دوستوں کو بھی کسی عُذر سے روکا ہوگا

یاد کر کے مجھے ، نم ہو گئی ہوں گی پلکیں
"آنکھ میں پڑ گیا کچھ" کہہ کے یہ ٹالا ہوگا

اور گھبرا کے کتابوں میں جو لی ہوگی پناہ
ہر سطر میں مرا چہرہ اُبھر آیا ہوگا

جب ملی ہوگی اُسے میری علالت کی خبر
اُس نے آہستہ سے دیوار کو تھاما ہوگا

سوچ کر یہ کہ بہل جائے پریشانیِ دل
یونہی بے وجہ کسی شخص کو روکا ہوگا!

انفاقاً مجھے اُس شام مِری دوست ملی
میں نے پوچھا کہ سُنو -- آئے تھے وہ؟ کیسے تھے؟
مجھ کو پوچھا تھا؟ مجھے ڈھونڈا تھا چاروں جانب؟
اُس نے اِک لمحے کو دیکھا مجھے اور پھر ہنس دی
اس ہنسی میں تو وہ تلخی تھی کہ اس سے آگے
کیا کہا اُس نے - مجھے یاد نہیں ہے - لیکن
اتنا معلوم ہے ، خوابوں کا بھرم ٹوٹ گیا!

☆☆☆☆☆

پریم وار برٹنی

پیدائش: 1930ء ...... وار برٹن،شیخوپورہ، پاکستان

وفات: 1979ء .... چندی گڑھ،انڈیا

پریم کمار اگروال، پریم وار برٹنی کی نظموں کے مطالعہ کے دوران مجھے ہر لمحہ وار برٹنی نے بے چین کیے رکھا کہ آخر شیخوپورہ میں رہنےاوروار برٹن کا ہمسایہ ہونے کے باوجود ہم پریم وار برٹنی سے کیوں نا آشنا ہیں۔ جب ذہن میں یہ خیال آیا کہ وار برٹن کوئی بھارت میں ہوگا تو پھر توجہ اُس کی شاعری پر مرکوز کر دی لیکن پھر ایک روز میں نے ستیہ پال آنند کو لکھا:

''سلام سر! رہنمائی فرمایئے گا کہ پریم وار برٹنی کہاں کے رہنے والے تھے۔ کیا یہ وہ ہی وار برٹن ہے جو ہمارے شیخوپورہ کا قصبہ ہے''؟

جواب ملا: ''جی ہاں''۔

ان کے والدین کی برتنوں کی دکان تھی۔ 1947ء میں یہ خاندان اپنا اثاثہ سمیٹ کر مالیر کوٹلہ (انڈیا) میں پہنچا اور وہاں زندگی شروع کی۔ پریم کمار اگروال کی عمر اُس وقت 15 - 16 برس کی تھی لیکن وہ وار برٹن کو نہیں بھولا اور اُس نے اِس قصبے کے نام کو اپنے نام کے ساتھ چپکائے رکھا۔

پریم نے بہت کم عمر پائی لیکن اپنے چاہنے والوں کے لیے تین خوب صورت مجموعے 'خوشبو کا خواب'، 'میرا فن میرا لہو' اور 'میرے اندر اِک سمندر' چھوڑ گیا۔

سمندر اور میں

میں کالی ریت کا ساحل سہی
کوئی تو ڈوبتے شب کے جزیرے سے
اُبھر کر روشنی کے بادباں کھولے
ستاروں کو بھنور کا ساز دے
کوئی تو آخرِ شب کو ذرا آواز دے
افق سے ناواقف، لیکن بڑی گہری اُداسی ہے
نہ کوئی نور کی مشعل، نہ کوئی گیت مانجھی کا
نہ کوئی گنگناتی سرپھری کشتی گھٹاؤں کی
ربابِ شش جہت کیوں دل شکستہ ہے؟
لباسِ گردشِ عالم بھی خستہ ہے
سمندر چیختا تھا میرے سینے میں کبھی لیکن
میں اب تو ریت کا تشنہ بہ لب سنسان ساحل ہوں
وہ ننگا اژدہا لیٹا ہوا ہے میرے سینے پر
کہ جس کو دوسرے لفظوں میں سنّاٹا بھی کہتے ہیں
نہ جانے کیوں، سمندر میں کوئی طوفاں نہیں اُٹھتا؟
مگر کچھ دور سُو نے مقبروں کے بے ثمر اونچے درختوں سے
اُڑے ہیں اس طرح دو پھڑ پھڑاتے کانپتے زخمی حسیں طائر
کہ جن کی دل شکن اور روح فرسا چیخ کو
سُن کر اچانک شب کا سایہ ڈر گیا ہے
زمیں تو زندہ ہے اب تک .... ہوا بھی سر برہنہ ہے
مگر روتا ہوا بوڑھا سمندر مر گیا ہے

☆☆☆☆☆

جگن ناتھ آزاد

پیدائش: 5۔دسمبر،1918ء .... عیسیٰ خیل، میانوالی، پاکستان
وفات: 24۔جولائی، 2004ء .... ممبئی، انڈیا

جگن ناتھ آزاد کے والد تلوک چند محروم اردو کے ایک مایہ ناز شاعر تھے، جن سے آزاد نے شاعری کے رموز سیکھے۔ 1937ء میں راولپنڈی سے بی اے کیا اور 1944ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے فارسی کی سند حاصل کی۔ تقسیمِ ہند کے وقت آزاد دہلی کی طرف ہجرت کر گئے اور وہاں 'ملاپ' میں نائب مدیر مقرر ہوئے۔ اُن ایّام میں جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، بلونت سنگھ اور پنڈت ہری چند اختر جیسے بڑے لوگوں سے روابط بڑھائے۔

نقاد، شاعر، مصنّف، ماہرِ تعلیم اور ماہرِ اقبالیات آزاد 70 کے قریب کتب کے خالق ہیں۔ 'اقبال اور مغربی مفکرین' اور 'اقبال، ہِز پوئٹری اینڈ فلاسفی' کا شمار اُن کی بہترین کتب میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی بابت کہا جاتا ہے اور شاید کسی انٹرویو میں اُنھوں نے خود بھی یہ دعویٰ کیا کہ اُنھیں حضرت قائدِ اعظم نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کا کہا، جو لکھا بھی گیا، ریکارڈ بھی ہوا اور 14 اور 15۔اگست، 1947ء کی درمیانی رات یہ ریڈیو پاکستان سے نشر بھی کیا گیا لیکن ایک گہری اور محتاط تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔ محققین میں ڈاکٹر صفدر محمود بھی شامل ہیں۔

آزاد کا پہلا شعری مجموعہ 'طبل و علم' 1948ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد بہت سا کلام شائع ہوا۔ اُنھوں نے اپنی نظموں میں محبّت اور انسان دوستی کا پیغام دیا اور اِسی بِناء پر وہ 'ادبی سفیر' بھی کہلائے۔ اُن کی نظموں میں 'بھارت کے مسلمان'، 'تری یاد'، 'خواب کی طرح سے یاد ہے' اور 'شہکارِ جمیل' بہت مقبول ہوئیں۔

شہکارِ جمیل

نامکمل رہ گیا فطرت کا اِک شہکار پھر
ایک شہکارِ جلیل
ایک شہکارِ جمیل
ایک نظم ....
ناز سے ہے سوز جس میں نور سے تاباں ہے جو
اِک غزل ....
زندگی کے ساز پر رقصاں ہے جو
اِک کہانی جس میں بادل کی گرج ہے اور بجلی کی کڑک
تُند شعلے کی بھڑک
صبحِ گلشن کی خموشی، شامِ صحرا کا سکوت
دل کی دُنیا کا سکوت
کوہساروں کا جلال
لازوالوں کا جمال
یہ کہانی، یہ غزل، یہ نظم، ابھی تکمیل کی منزل کو پہنچی تھی کہاں
نوکِ نشتر، وہ جو خونِ دل میں تھی ڈوبی ہوئی
شاید ابھی تک تھی رواں
کہتے کہتے یہ کہانی سو گیا افسانہ خواں
نامکمل رہ گیا فطرت! ترا شہکار پھر

☆☆☆☆☆

جمشید مسرور

پیدائش: 4۔اکتوبر،1946ء ...... گجرات، پاکستان
بقیدِ حیات ہیں اور ناروے میں مقیم ہیں۔

شاعر، معلّم، ڈرامہ نگار اور ادیب جمشید اقبال رانا، جمشید مسرور پاکستانی گجرات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں ہی گجرات سے لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور سے ترکِ سکونت کے بعد ناروے چلے گئے اور یوں یورپ میں اُردو ادب کی شمع منوّر کی۔ اُنھوں نے انگلش، اُردو اور نارویجن زبانوں میں لکھا اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

جمشید نے ناروے منتقلی کے بعد جلد ہی وہاں ایک انٹرنیشنل مشاعرے کا اہتمام کیا اور یہ سلسلہ تقریباً چار عشروں سے جاری ہے۔ اُنھوں نے نارویجن شاعری کا اُردو ترجمہ بھی کیا جو 'دیوارِ ہوا پر آئینہ' کے نام سے شائع ہوا۔ اُنھوں نے اعلیٰ درجے کی نظم تخلیق کی۔ 'تاریکی'،
'اجنبی'، 'فراز'، 'چھوئی موئی' اور 'اے غمِ دہر ذرا' اُن کی مقبول نظمیں ہیں۔

اے غمِ دہر ذرا

درد کے زہر ذرا اور ابھی رہنے دے
اے غمِ دہر ذرا اور ابھی رہنے دے

میرے بالیں پہ بکھرتی ہوئی زُلفوں کی طرح
اُنھی شاموں ، اُنھی راتوں کو لہک لینے دے
دیر سے ترسے ہوئے دید کے پیمانوں کو
عارض و لب کی تصور سے چھلک لینے دے
دیر کے بعد ملا ہے کوئی ساتھی اپنا
شانۂ یار پہ کچھ دیر سِسک لینے دے

تیز اُلجھے ہوئے سانسوں سے سوالات کیے
چاند سے بات کیے ، گُل سے ملاقات کیے
ساغرِ شوق سے جاناں کی مدارات کیے
ہو گئی دیر بہت عزمِ خرابات کیے

اب عنایت ہو کہیں دل کے تڑپنے کا صلہ
وہی رخسار ، وہی ہاتھ ، وہی رنگِ حِنا
پھر ہو اِک بار مِری عمر کی محرومی کو
اُنھی آنکھوں ، انھی ہونٹوں ، اُنھی زلفوں کی عطا
اے غمِ دہر ذرا اور ابھی رہنے دے

☆☆☆☆☆

چھوئی موئی

وہ اتنی پاک ہے ، معصوم ہے جیسے کلی کوئی
جسے چُھو کر نہ دیکھا ہو ، ابھی چلتی ہواؤں نے
لگایا ہو نہ سینے سے ابھی سورج کی کرنوں نے
جُھلایا ہو نہ باہوں میں گل اندر گل فضاؤں نے
وہ آنکھوں میں جو دیکھے عمرِ رفتہ لوٹ کر آئے
گلابی کم سِنی اُس کے بدن سے رنگ برسائے
وہ بچپن کی ہنسی ہنستی جو کمرے میں چلی آئے
دلِ برباد کی حالت کوئی کیا اُس کو بتلائے
مگر اتنا کہ بڑھ کر بے خودی اُس سے لپٹ جائے

☆☆☆☆☆

جوش ملیح آبادی

پیدائش: 5۔دسمبر،1898ء ...... ملیح آباد،انڈیا

وفات: 22۔فروری،1982ء ...... اسلام آباد، پاکستان

قادرالکلام عہد آفرین مزاحمتی انقلابی شاعر شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کو لوگوں نے اُردو کا شیکسپئر کہا ہے لیکن اُن کا خیال تھا کہ وہ حافظ شیراز ہیں۔ وہ اپنے بارے اور بھی بہت کچھ لکھتے رہے۔مثلاً:

کام ہے میرا تغیّر ، نام ہے میرا شباب   میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوش نے کم و بیش ایک لاکھ اشعار کہے اور اُس میں بہت سا کلام آزادی، انقلاب اور مزاحمت سے متعلقہ ہے۔ جب اُن کی شاعرانہ عظمت کو ہر جگہ سیلیوٹ کیا جا رہا تھا تو اُنھوں نے 'اعترافِ عجز' کیا اور کہا:

آسماں جاگا ہے سر میں اور سینے میں زمیں   اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں

جہل کی منزل میں تھا مجھ کو غرورِ آگہی   اتنی لا محدود دُنیا اور میری شاعری !

فکر میں کامل نہ فنِ شعر میں یکتا ہوں میں   کچھ اگر ہوں تو نقیبِ شاعرِ فردا ہوں میں

جوش بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ 1914ء میں سلیم پانی پتی کے کہنے پر نظم کی ابتداء کی ۔ اُن کی طویل ترین نظم 'حرفِ آخر' ہے۔ میں نے یہاں اِس مجموعے کے مزاج کے مطابق 'حُسن اور مزدوری' کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن چلتے چلتے جوش کے اِس شعر سے بھی حظ اُٹھائیں:

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا

پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

حُسن اور مزدوری

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بے قرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کُوٹنے میں بار بار
چوڑیوں کے ساز میں یہ شور ہے کیسا بھرا
آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا
گرد ہے رُخسار پر زُلفیں اٹی ہیں خاک میں
نازکی بل کھا رہی ہے دیدۂ غم ناک میں
ہو رہا ہے جذب مہرِ خونچکاں کے روبرو
کنکروں کی نبض میں اُٹھتی جوانی کا لہو
دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکلِ عنبر سرشت
ہو رہا ہے کم سِنی کا نوچ جزوِ سنگ و خِشت
پی رہی ہیں سرخ کرنیں مہرِ آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رس مَے چمپئی رُخسار کی
غم کے بادل خاطرِ نازک پہ ہیں چھائے ہوئے
عارضِ رنگیں ہیں یا دو پھول مُرجھائے ہوئے
چیتھڑوں میں دیدنی ہے رُوّئے رنگینِ شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب
اُف یہ ناداری! مِرے سینے سے اُٹھتا ہے دُھواں
آہ! اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں

حُسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے
فکر سے جُھک جائے وہ گردن تُف اے لیل و نہار
جس میں ہونا چاہیے پھولوں کا اِک ہلکا سا ہار
آسماں جانِ طرب کو وقفِ رنجوری کرے
صنفِ نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے
بھیک میں وہ ہات اُٹھیں ، التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا ہو حِنا کے واسطے
نازکی سے جو اُٹھا سکتی نہ ہوں کاجل کا بار
اُن سُبک پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار
کیوں فلک مجبور ہوں آنسو بہانے کے لیے
انکھڑیاں ہوں جو دلوں میں ڈوب جانے کے لیے
مفلسی چھانٹے اُسے قہر و غضب کے واسطے
جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے
فرطِ خُشکی سے وہ لب ترسیں تکلّم کے لیے
جن کو قدرت نے تراشا ہو تبسّم کے لیے
دستِ نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
اِس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیے

☆☆☆☆☆

حبیب جالب

پیدائش: 24۔مارچ،1928ء ...... ہوشیار پور، انڈیا

وفات: 13۔مارچ،1993ء ...... لاہور، پاکستان

مزاحمت کا استعارہ اور عوام کی زبان میں بات کرنے والا ناقابلِ فراموش شاعر حبیب جالب 1947ء میں ہوشیار پور سے کراچی اور پھر کراچی سے لاہور منتقل ہو گیا۔ تلاشِ معاش کے لیے روزنامہ جنگ اور لائل پور ٹیکسٹائل ملز سے منسلک رہا۔ زندگی بھر جبر اور سیاسی گھٹن کے خلاف آواز بلند کر کے کروڑوں دِلوں پر حکمرانی کی۔

ریاض شاہد کی فلم 'زرقا' میں شامل اپنے گیت:

تُو کہ ناواقفِ آدابِ غلامی ہے ابھی

رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

کے بعد شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔

نظموں کے مقبولِ عام مجموعوں 'برگِ آوارہ'، 'سرِ مقتل'، 'عہدِ ستم'، 'ذکر بہتے خون کا' اور 'گوشے میں قفس کے' کے علاوہ اُس کی تخلیقات میں 'صراطِ مستقیم'، 'گُنبدِ بے در'، 'اِس شہرِ خرابی میں'، 'حرفِ حق'، 'حرف سرِ دار' اور 'احادِ ستم' شامل ہیں۔

حبیب جالب کے دامن میں اگر ہزار ہا اشعار اور سینکڑوں نظمیں نہ بھی ہوتیں تو اُسے زندہ رکھنے کے لیے 'دستور' کافی تھی، جو اُس نے 1962ء کے ایوبی آئین کے ردِ فعل کے طور پر تحریر کی۔

دستور

دیپ جس کا محلّات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو ، صبحِ بے نور کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں مانتا

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زِنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو ، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں مانتا

پھول شاخوں پہ کھلنے لگے ، تم کہو
جام رِندوں کو ملنے لگے ، تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے ، تم کہو
اِس کُھلے جھوٹ کو ، ذہن کی لُوٹ کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں مانتا

تم نے لُوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمھارا فسوں
چارہ گر میں تمھیں کس طرح سے کہوں
تم نہیں چارہ گر ، کوئی مانے ، مگر
میں نہیں مانتا ، میں نہیں مانتا

☆☆☆☆☆

حفیظ جالندھری

پیدائش: 14۔جنوری،1900ء ...... جالندھر،انڈیا

وفات: 21۔دسمبر،1982ء ...... لاہور، پاکستان

ابوالاثر عبدالحفیظ، حفیظ جالندھری اُردو کے نام ور رومانی شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ اُنھوں نے رسمی تعلیم تو حاصل نہ کی مگر اُن کے وسیع مطالعہ نے اسناد کے عدم حصول کو محسوس نہ ہونے دیا۔ اُنھوں نے فارسی شاعر مولانا غلام قادر بلگرامی سے اصلاح لی اور اقبال کے علاوہ مولانا سے بھی بہت متاثر رہے۔ جالندھر سے پاکستان ہجرت کے بعد لاہور میں اُن کی نشست و برخاست ایک اُستاد اور شاعر سراج الدین ایمن سے بھی رہی۔ آپ ڈائریکٹر جنرل مورال پاکستان،صدرِ پاکستان کے چیف ایڈوائزر اور رائٹرز گِلڈ کے سربراہ بھی رہے۔

آپ کا افسانوی مجموعہ'ہفت پیکر' اور گیتوں کا مجموعہ 'ہندوستاں ہمارا' اُن کے 'شاہ نامہ اسلام' اور 'قومی ترانہ' کے نیچے دب کر رہ گئے ہیں۔اُن کے کئی ایک شعری مجموعے شائع ہوئے۔ اُنھیں حکومت پاکستان کی طرف سے ہلالِ امتیاز اور تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔

اُن کے دو خوبصورت اور زبانِ زدِعام اشعار ملاحظہ فرمائیں:

☆ دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف — اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

☆ ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے — تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمھیں بھلا سکے

'شاہنامہ اسلام' اور 'قومی ترانے' کے علاوہ حفیظ جالندھری کی جو تخلیق پڑھنے اور سُننے والوں کو کبھی نہ بھول پائے گی وہ اُن کی نظم 'ابھی تو میں جوان ہوں' ہے۔ جو ملکہ پکھراج نے گائی اور اسے امر کر دیا۔ آئیے پڑھتے ہیں:

ابھی تو میں جوان ہوں

[1]

ہوا بھی خوش گوار ہے گُلوں پہ بھی نکھار ہے
ترنّمِ ہزار ہے بہار پُر بہار ہے
کہاں چلا ہے ساقیا
اِدھر تو لوٹ اِدھر تو آ
ارے یہ دیکھتا ہے کیا
اُٹھا سبو ، سبو اُٹھا
سبو اُٹھا پیالہ بھر پیالہ بھر کے دے اِدھر
چمن کی سمت کر نظر سماں تو دیکھ بے خبر
وہ کالی کالی بدلیاں
افق پہ ہو گئیں عیاں
وہ اِک ہجومِ مے کشاں
ہے سُوئے میکدا رواں
یہ کیا گماں ہے بدگماں سمجھ نہ مجھ کو ناتواں
خیالِ زُہد ابھی کہاں ابھی تو میں جوان ہوں

[2]

عبادتوں کا ذکر ہے نجات کی بھی فکر ہے
جنون ہے ثواب کا خیال ہے عذاب کا
مگر سُنو تو شیخ جی
عجیب شے ہیں آپ بھی
بھلا شباب و عاشقی
الگ ہوئے بھی ہیں کبھی
حسین جلوہ ریز ہوں ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگاہ ہائے فتنہ گر
کوئی اِدھر کوئی اُدھر
اُبھارتے ہوں عیش پر
تو کیا کرے کوئی بشر؟
چلو جی قصّہ مختصر تمھارا نقطۂ نظر
درست ہے تو ہو مگر ابھی تو میں جوان ہوں

[3]

یہ گشت کوہسار کی یہ سیر جوئبار کی
یہ بلبلوں کے چہچہے یہ گل رخوں کے قہقہے
کسی سے میل ہو گیا
تو رنج و فکر کھو گیا

کبھی جو بخت سو گیا
یہ ہنس گیا وہ رو گیا

یہ عشق کی کہانیاں یہ رس بھری جوانیاں
اُدھر سے مہربانیاں اِدھر سے لن ترانیاں

یہ آسماں اور یہ زمیں
نظارہ ہائے دل نشیں
انھیں حیات آفریں
بھلا میں چھوڑ دوں یہیں

ہے موت اِس قدر قریں مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں نہیں ابھی نہیں ابھی تو میں جواں ہوں

[4]

نہ غم کشود و بست کا بلند کا نہ پست کا
نہ بود کا نہ ہست کا نہ وعدۂ الست کا

امید اور یاس گم
حواس گم قیاس گم
نظر سے آس پاس گم
ہمہ بجُز گلاس گم

نہ مے میں کچھ کمی رہے قدح سے ہمدمی رہے
نشست یہ جمی رہے یہی ہما ہمی رہے

وہ راگ چھیڑ مطربا

طرف فزا الم رُبا

اثر صدائے ساز کا

جگر میں آگ دے لگا

ہر ایک لب پہ ہو صدا نہ ہاتھ روک ساقیا

پلائے جا پلائے جا

ابھی تو میں جوان ہوں

☆☆☆☆☆

راہی معصوم رضا

پیدائش: 1925ء اور 1928ء کے درمیان کہیں ...... غازی پور، یو پی، انڈیا
وفات: 15۔مارچ، 1992ء .... ممبئی، انڈیا

ناول نگار اور شاعر ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے علی گڑھ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا اور وہیں سے 'طلسمِ ہوش رُبا .... ایک مطالعہ' کے عنوان سے مقالہ پر پی ۔ایچ ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔فلم کے لیے نغمہ نگاری اور مکالمہ نگاری میں نام کمایا اور دُور درشن پر بھی بہت مقبول ہوئے۔''میں تُلسی تیرے آنگن کی' کے لیے بہترین مکالمہ نگاری پر فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیا۔'آدھا گاؤں' اور 'ٹوپی شکلا' ناول بہت مقبول ہوئے۔شعری مجموعے 'اجنبی شہر، اجنبی راستے' اور 'غریبِ شہر' قارئین کی بھرپور توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

جگجیت سنگھ کی آواز میں مقبولِ عام غزل 'ہم تو ہیں پردیس میں، دیس میں نکلا ہوگا چاند' راہی کے قلم کا شاہکار ہے۔اُن کی نظمیں 'تنہائی'، 'چاند اور چکور'، 'اُمید' اور 'چاند کی بُڑھیا' بہت مقبول ہوئیں۔

تنہائی

آج اپنے کمرے میں
کِس قدر اکیلا ہوں
شام کا دھندلکا ہے
سوچتا ہوں گن ڈالوں

دوستوں کے ناخن سے
کتنے زخم کھائے ہیں
اُن کی سمت سے دل پر
کتنے تیر آئے ہیں

چونک چونک اُٹھتا ہوں
کھانسیوں کی آہٹ سے
کاش کچھ ہوا چلتی
کھڑکیوں کے پٹ ہلتے

تک رہا ہے آئینہ
شیشیوں کی صف چپ ہے
تُو ہی بول تنہائی
وقت ہر طرف چپ ہے

کھڑکیوں کی آنکھوں سے
آسماں کو تکتا ہوں
آج اپنے کمرے میں
کس قدر اکیلا ہوں

گھر کے سامنے اب بھی
ایک راستہ ہوگا
کوئی آ رہا ہوگا
کوئی جا رہا ہوگا

چھیڑتی ہی رہتی ہیں
اِس خیالِ قربت کو
صد ہزار آوازیں
آتی ہیں عیادت کو

مُنہ سے خون آتا ہے
کتنی دور منزل ہے
دِق کہ سر پھرے ناقد
کون میرا قاتل ہے

لفظوں کی دُکانوں پر
جذبۂ صداقت کیا
خونِ دل دیا میں نے
خونِ دل کی قیمت کیا

اِس پہ کچھ بزرگوں کی
مجرمانہ خاموشی
لائقِ نظارہ ہے
رفعتوں کی پستی بھی

رہبروں سے شِکوَہ ہے
شوق سے خفا ہوتے
ہاں مگر تغافل میں
جُرأت آزما ہوتے

آج اپنے کمرے میں
کس قدر اکیلا ہوں
صرف دل دھڑکتا ہے
ہاں میں پھر بھی زندہ ہوں

کیوں کہ زندگی میری
عہد کی علامت ہے
انقلابِ فردا کی
اِک بڑی امانت ہے

میرے فن کی قندیلیں
ہیں دِلوں کی راہوں پر
بجلیاں گراتی ہیں
یاس کی گھٹاؤں پر

ہونٹوں پر تبسم کے
کچھ دیئے جلاتی ہیں
رنگ و نور و نغمہ کے
کچھ پیام لاتی ہیں

لفظوں کے کٹوروں میں
روحِ عصر بھرتی ہیں
آج کے سوالوں کا
حل تلاش کرتی ہیں

جب تلک مہکتا ہے
گُل کدہ مِرے فن کا
اے یقینِ فصلِ گُل
فکرِ جیب و دامن کیا

☆☆☆☆☆

چاند کی بڑھیا

ماں سے ایک بچے نے پوچھا

چاند میں یہ دھبّا کیسا ہے

ماں یہ بولی

چندا بیٹے

جس کو تم دھبّا کہتے ہو وہ تو اک پاگل بڑھیا ہے

بچے نے معصوم آنکھوں سے کچھ لمحوں تک ماں کو بڑی حیرت سے دیکھا

اور یہ پوچھا:

ماں! جب میں چندا بیٹا ہوں تو مجھ میں بھی اِک پاگل بُڑھیا ہوگی

ماں نے اُس کو بھینچ لیا

اُس کے لب چومے

گردن چومی، ماتھا چوما

اور یہ بولی: ہاں تجھ میں بھی اِک بُڑھیا ہے

☆☆☆☆☆

رضی الدین رضی

پیدائش: 7۔مئی،1964ء .... ملتان، پاکستان

بقیدِ حیات ہیں اور ملتان میں مقیم ہیں۔

مصنف، شاعر اور صحافی رضی الدین رضی، شیخ ذکاء الدین اُپل کے صاحب زادے ہیں اور ملتان میں مقیم ہیں۔ پاکستانی سیاست کے زیر و بم، نعت و نظم میں رضی کی گہری دلچسپی ہے اور یہ دلچسپی اُن کی تخلیقات سے واضح ہے۔ وہ ایک دردِ دل رکھنے والے پاکستانی اور حسّاس فن کار ہیں۔

رضی کی درجِ ذیل کُتب اُن کی شخصیت کی بہترین عکّاس ہیں:

1۔ بے نظیر بھٹو کی پرائم منسٹر ہاؤس سے واپسی

2۔ پاکستان 58 سال: 14۔اگست، 1947ء سے 14۔اگست، 2005ء تک

3۔ آدھا سچ

4۔ مہکتے حرف .... نعتیہ مجموعہ

5۔ محبت کی نظمیں

6۔ وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا

آیئے اس ہفت پہلو شخصیت کی ایک خوب صورت نظم 'چل عمر کی گٹھڑی کھولتے ہیں' کا مطالعہ کرتے ہیں۔

چل عمر کی گٹھڑی کھولتے ہیں

چل عمر کی گٹھڑی کھولتے ہیں
اور دیکھتے ہیں
ان سانسوں کی تفحیک میں سے
اِس ماہ و سال کی بھیک میں سے
اِس ضرب، جمع، تفریق میں سے
کیا حاصل ہے کیا لا حاصل

چل گٹھڑی کھول کے لمحوں کو
کچھ وصل اور ہجر کے برسوں کو
کچھ گیتوں کو، کچھ اشکوں کو
پھر دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں
یہ درد بھری سوغات ہے جو
یہ جیون کی خیرات ہے جو
اِک لمبی کالی رات ہے جو
سب اپنے پاس ہی کیوں آئی
یہ ہم کو راس ہی کیوں آئی

یہ دیکھ یہ لمحہ میرا تھا جو اور کسی کے نام ہوا

یہ دیکھ یہ صبح کا منظر تھا جو صبح سے مثلِ شام ہوا

اور یہ میرا آغاز پڑا جو بدتر از انجام ہوا

اب چھوڑ اِسے اور دیکھ اِدھر

یہ حبس پڑا اور ساتھ اس کے

کچھ اُکھڑی اُکھڑی سانسیں ہیں

اِک دُھندلا دُھندلا منظر ہے

اور اُجڑی اُجڑی آنکھیں ہیں

یہ جھلسے ہوئے کچھ خواب ہیں جن کے ساتھ کوئی تعبیر نہیں

یہ دیکھ حنائی ہاتھ بھی ہیں پر وصل کی ایک لکیر نہیں

دو نازک ہونٹ گلاب سے ہیں پر داد جو دے وہ میرؔ نہیں

اِک اِسم محبت والا ہے اور اس کی بھی تفسیر نہیں

بس اِتنی ہمت تھی تجھ میں

بس تیری آنکھیں بھیگ گئیں

ابھی اور بہت سے لمحے ہیں

ابھی اور بہت سی باتیں ہیں

ابھی ہجر بھرا اِک حُجرہ ہے

ابھی درد بھری اِک کٹیا ہے

چل چھوڑ اِس درد کہانی کو

روک آنکھ سے بہتے پانی کو

آ ڈھونڈ کہیں اِس گٹھڑی میں

اِک ہجر آلود سا وعدہ ہے

وعدہ بھی سیدھا سادہ ہے

بس اپنے اپنے رستے پر

چلتے رہنے کا اِرادہ ہے

تُو دیکھ اگر وہ مل جائے

ممکن ہے زخم بھی سِل جائے

ورنہ ہم ہجر جو کاٹ چکے

وہ اِس جیون سے زیادہ ہے

☆☆☆☆☆

زہرہ نگاہ

پیدائش: 14۔مئی، 1937ء ...... حیدرآباد، اِنڈیا

کراچی میں بقیدِ حیات ہیں (ماشاءاللہ)

فاطمہ زہرہ، زہرہ نگاہ کے والد قمر مقصود کا شمار بدایوں کے ممتاز لوگوں میں ہوتا تھا لیکن وہ بسلسلہ معاش حیدرآباد دکن کی طرف ہجرت کر گئے۔ وہیں فاطمہ پیدا ہوئیں۔ تقسیمِ ہند کے وقت آپ کا خاندان کراچی میں آباد ہو گیا۔ آپ ڈرامہ نگار فاطمہ ثریا بجیا اور ٹی وی فیم انور مقصود کی بہن ہیں۔ بچپن سے ہی شاعری سے عشق تھا، لہٰذا کامیاب شاعرہ بنیں۔

زہرہ نگاہ نے بہت خوب صورت غزل کہی اور عمدہ نظم تخلیق کی۔ آپ کے تین مجموعے 'شام کا پہلا تارہ'، 'ورق' اور 'فراق' شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں صدارتی تمغہ برائے حُسنِ کارکردگی سے نوازا جا چکا ہے۔

زہرہ نگاہ کی شاعری میں جدیدیت کا کوئی پرتو ہے اور نہ رومانیت کی آرائش، لیکن پھر بھی ان کی نظموں میں بلا کی چاشنی ہے۔ وہ یقیناً صنفِ نازک کی شاعرہ ہیں۔

ایک لڑکی

کیسا سخت طوفاں تھا
کتنی تیز بارش تھی
اور میں ایسے موسم میں
جانے کیوں بھٹکتی تھی
وہ سڑک کے اُس جانب
روشنی کے کھمبے سے
سر لگائے ایستادہ
آنے والے گاہک کے
انتظار میں گُم تھی
خال و خد کی آرائش
بہہ رہی تھی بارش میں
تیر نوکِ مژگاں کے
مِل گئے تھے مٹی میں
گیسوؤں کی خوش رنگی
اُڑ رہی تھی جھونکوں میں
میں نے دل میں یہ سوچا
آب و باد کا ریلا
اُس کو راکھ کر دے گا
یہ سجا بنا چہرہ

کیا ڈراؤنا ہوگا
پھر بھی اس کو لے جانا
آنے والے گاہک کا
اپنا حوصلہ ہوگا

بارشوں نے جب اُس کا
رنگ ورُوپ دھوڈالا
میں نے ڈرتے ڈرتے پھر
اُس کو غور سے دیکھا
سیدھا سادہ چہرہ تھا
بھولا بھالا نقشہ تھا
رنگِ کم سِنی جس پر
کیسے ڈُھل کے آیا تھا
زرد پھول سا پتہ
گیسوؤں میں اُلجھا تھا
شبنمی سا اِک قطرہ
آنکھ پر لرزتا تھا
راکھ کی جگہ اُس جا
اِک دِیا سا جلتا تھا
مجھ کو یوں لگا ایسے!
جیسے میری بیٹی ہو
میری ناز کی پالی!
میری کوکھ جائی ہو

ڈال سے بندھا جھولا

طاق میں سجی گُڑیا

گھر میں چھوڑ آئی ہو

تیز تیز چلنے پر

میں نے اُس کوٹو کا ہو

ہاتھ تھام لینے پر

میرا اُس کا جھگڑا ہو

کھو گئی ہو میلے میں

بہہ گئی ہو ریلے میں

اور پھر اندھیرے میں

اپنے گھر کا دروازہ

خود نہ دیکھ پائی ہو

دفعتاً یہ دل چاہا

اُس کو گود میں بھر لوں

لے کے بھاگ جاؤں میں

ہاتھ جوڑ لُوں اُس کے

چوم لُوں یہ پیشانی

اور اُسے مناؤں میں

پھر سے اپنے آنچ کا

گھونسلہ بناؤں میں

اور اُسے چھپاؤں میں

☆☆☆☆☆

حدود آرڈیننس

(اُن لڑکیوں کے نام جو حدود آرڈیننس کی سزا کاٹ رہی ہیں)

[1]

میں اِس چھوٹے سے کمرے میں
آزاد بھی ہوں اور قید بھی ہوں
اِس کمرے میں اِک کھڑکی ہے
جو چھت کے برابر اُونچی ہے
جب سورج ڈوبنے لگتا ہے
کمرے کی چھت سے گزرتا ہے
مٹھی بھر کرنوں کے ذرّے
کھڑکی سے اندر آتے ہیں
اِک رستہ سا بن جاتے ہیں
میں اس رستے پر چلتی ہوں
اور اپنے گھر ہو آتی ہوں
میرا باپ ابھی تک میرے لیے
جب شہر سے واپس آتا ہے
چوڑی کنگھی لے آتا ہے
آپا میرے حصے کی روٹی
چنگیر میں ڈھک کر رکھتی ہے

(2)

پھر چڑیوں کو دے دیتی ہے
میرے دونوں بھائی اب بھی
مسجد میں پڑھنے جاتے ہیں
احکامِ خدا وندی سارے
سنتے ہیں اور دُہراتے ہیں
ماں ، میرے غم میں پاگل ماں
بس پتھر چُنتی رہتی ہے
یا دانہ چگتی چڑیوں سے
کچھ باتیں کرتی رہتی ہے
وہ کہتی ہے جب یہ چڑیاں
سب اُن کی باتیں سمجھ لیں گی
چونچوں میں پتھر چُگ لیں گی
پنجوں میں سنگ سمو لیں گی
پھر وہ طوفاں آ جائے گا
جس سے ہر منصف ، ہر منبر
پارہ پارہ ہو جائے گا

(3)

اور میری گواہی وہ دے گا
جو سب کا حاکمِ اعلیٰ ہے
جو منصف عزت والا ہے

☆☆☆☆☆

ساحرلدھیانوی

پیدائش: 8۔مارچ،1921ء ...... لدھیانہ،انڈیا

وفات: 25۔اکتوبر،1980ء ...... ممبئی،انڈیا

لدھیانہ کے زمیندار چوہدری فضل محمد کے ہاں جنم لینے والا عبدالحئی اردو شاعری کی دُنیا میں ساحرلدھیانوی کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کا باپ ایک جاگیردار تھا اور دولت کی ریل پیل تھی۔ساحر کی ماں کی موجودگی میں باپ نے دوسری شادی کی تو ماں سردار بیگم نے ساحر کی اُنگلی تھامی اور ایک انجانی اور اُداس راہ پر چل نکلی۔

1943ء میں ساحر لاہور آ گیا۔لاہور میں ابنِ انشاء، احمد راہی اور شورش کاشمیری جیسے لوگوں سے دوستی رہی۔لاہور میں ہی 'تلخیاں' مکمّل کی اور 'ادبِ لطیف'، 'سویرا' اور 'شہکار' جیسے پرچوں کی ادارت بھی کی۔لاہور میں وہ ایک ریلوے افسر کی الٹرا ماڈرن افسانہ نگار بیوی کے عشق میں گرفتار رہا۔اس سے پہلے وہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کے پرنسپل کی بیٹی سے روابط بڑھانے کے چکر میں کالج سے نکالا گیا تھا۔

ساحر لاہور میں ہی تھا کہ ہندوستان کی تقسیم ہوگئی۔حکومت پاکستان نے اشتراکیت کے پرچار پر اُس کے وارنٹ جاری کررکھے تھے۔سو وہ جون،1948ء میں پاکستان کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گیا۔ہندوستان میں ساحر کی داستانِ عشق میں جو نئے کردار نظر آئے وہ امرتا پریتم، لتا منگیشکر اور سودھا ملہوترا کے ہیں۔امرتا بھی لاہور کی افسانہ نگار کی طرح شادی شدہ تھی اور سردار پریتم سنگھ جیسے خوش حال شخص کی بیوی تھیں لیکن ساحر کے عشق میں عقل نام کی کوئی چیز نہ تھی۔یہ بات البتہ خوش آئند ہے کہ ساحر نے کسی کیساحر نے کسی کے گھر کو برباد کرنے کی کوشش نہ کی۔اُس نے اپنا گھر بھی آباد نہ کیا،جس کی کوئی معقول وجہ سامنے نہیں آئی۔

لتا سے مایوسی کے بعد ساحر نے سودھا ملہوترا سے شادی کا سوچا لیکن اُس کے والدین نہیں مانے۔ وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں تھا کہ اُس کے چاہنے والوں نے ایک شامِ ساحر کا اہتمام کیا۔ یہ وہ تقریب تھی جس میں ساحر اور سودھا ملہوترا آخری بار اکٹھے ہوئے۔ سودھا نے ساحر کے گیت حاضرین کو سنائے اور ساحر نے یہ نظم اُس کی سماعت کی نذر کی:

'چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں'

ساحر نے بہت عشق کیے لیکن ہر جگہ ناکام رہا۔ شاید اِسی لیے لوگ اُسے ایک ناکام عاشق اور کامیاب شاعر کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ اُس نے اپنے چاہنے والوں کے لیے 'تلخیاں'، 'تنہائیاں'، 'آؤ کہ کوئی خواب بُنیں' اور 'گاتا جائے بنجارا' جیسے شاہکار چھوڑے ہیں۔

اُسے 1963ء میں 'تاج محل' اور 1976ء میں 'کبھی کبھی' کے نغمات پر فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسی دوران اسے 1971ء میں بھارت میں قابلِ قدر پدم شری کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

خوب صورت موڑ

چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے
نہ ظاہر ہو تمھاری کشمکش کا راز نظروں سے

تمھیں بھی کوئی اُلجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں
مِرے ہمراہ بھی رُسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمھارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں

تعارف روگ ہو جائے تو اُس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اُس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اُسے اِک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

☆☆☆☆☆

تاج محل

تاج تیرے لیے اِک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اِس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ میں ہوں سِطوتِ شاہی کے نشاں
اُس پہ اُلفت بھری رُوحوں کا سفر کیا معنی؟

میری محبوب! پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تُو نے سِطوَت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی!
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

اَن گِنت لوگوں نے دُنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُن کے
لیکن اُن کے لیے تشہیر کا سامان نہیں
کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مُفلس تھے

یہ عمارات و مقابر ، یہ فصیلیں ، یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسُور ہیں ، کُہنہ ناسُور
جذب ہے اِن میں ترے اور مرے اجداد کا خوں

میری محبوب! انھیں بھی تو محبت ہوگی

جن کی صنّاعی نے بخشی ہے اِسے شکلِ جمیل

ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود

آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار ، یہ جمنا کا کنارہ ، یہ محل

یہ منقش در و دیوار ، یہ محراب ، یہ طاق

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارہ لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

☆☆☆☆☆

شکست

اپنے سینے سے لگائے ہوئے امید کی لاش
مُدّتوں زیست کو ناشاد کیا ہے میں نے
تُو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار
دِل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے

جب بھی راہوں میں نظر آئے حریری ملبوس
سرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے میں نے

اور اب جب کہ مِری رُوح کی پہنائی میں
ایک سُنسان سی مغموم گھٹا چھائی ہے
تُو دمکتے ہوئے عارض کی شعاعیں لے کر
گُل شُدہ شمعیں جلانے کو چلی آئی ہے

میری محبوب! یہ ہنگامۂ تجدیدِ وفا
میری افسردہ جوانی کے لیے راس نہیں
میں نے جو پھول چُنے تھے تِرے قدموں کے لیے
اُن کا دُھندلا سا تصور بھی مِرے پاس نہیں

ایک یخ بستہ اُداسی ہے دِل و جاں پہ محیط
اب مِری روح میں باقی ہے، نہ امید، نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بارسلاسل کے میری درماندہ
جوانی کی اُمنگوں کا خروش

ریگ زاروں میں بگولوں کے سِوا کچھ بھی نہیں
سایۂ ابرِ گریزاں سے مجھے کیا لینا
بجھ چکے ہیں مِرے سینے میں محبت کے کنول
اب ترِے حُسنِ پشیماں سے مجھے کیا لینا

تیرے عارض پہ یہ ڈھلکے ہوئے سیمیں آنسو
میری افسردگیٔ غم کا مداوا تو نہیں
تیری محبوب نگاہوں کا پیامِ تجدید
اِک تلافی ہی سہی ، میری تمنّا تو نہیں

☆☆☆☆☆

سُدرشن فاکر

پیدائش: 1934ء .... فیروز پور، انڈیا

وفات: 19/18۔فروری، 2008 ء ......جالندھر، انڈیا

فیروز پور میں ابھی میٹرک ہی پاس کیا تھا کہ (’ٹربیون‘ (Tribune) کو دیے گئے ایک انٹرویو کے مطابق) ایک ناکام محبت کے نتیجے میں جائے پیدائش کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا اور یوں جالندھر کو مسکن بنالیا۔ DAV کالج جالندھر سے بی اے کیا۔ کالج میں ہی شاعری اور ڈرامہ سے رغبت پیدا ہوگئی تھی۔ جالندھر میں ہی ایم اے پولیٹیکل سائنس اور ایم اے انگلش کے امتحانات پاس کیے۔ اُنھیں نے اُردو، ہندی اور انگلش میں لکھا۔

اُن کی نظم ’یہ دولت بھی لے لو، یہ شہرت بھی لے لو‘ نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ لیجنڈ جگجیت سنگھ کی آواز میں یہ نظم 1987ء میں فلم ’آج‘ کا حصہ بنی تو سُدرشن اور جگجیت سنگھ برِّصغیر پاک و ہند میں شُہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔

1982ء میں سُدرشن فاکر پہلے نغمہ نگار تھے جنھیں فلم فیئر ایوارڈ دیا گیا۔ سُدرشن کے فلمی گیت، غزلیں اور نظمیں تمام ہی بے پناہ مقبول ہوئے۔ شاعری یا موسیقی سے لگاؤ رکھنے والا پاک و ہند کا شاید ہی کوئی شخص ’وہ کاغذ کی کشتی، وہ بارش کا پانی‘ سے ناواقف ہوگا۔ بیگم اختر اور جگجیت سنگھ، سدرشن فاکر کے کلام کے منتظر رہتے تھے۔ انھوں نے اسے بے پناہ محبت اور عقیدت سے گایا۔ شاید فاکر مشرقی پنجاب کے غیر مسلم شاعروں میں سب سے بڑا نام ہے۔ غزل کے چند اشعار دیکھیئے:

☆ شاید میں زندگی کی سحر لے کے آ گیا　　قاتل کو آج اپنے ہی گھر لے کے آ گیا

تا عمر ڈھونڈتا رہا منزل میں عشق کی　　انجام یہ کہ گردِ سفر لے کے آ گیا

☆ عشق ہے عشق، یہ مذاق نہیں　　چند لمحوں میں فیصلہ نہ کرو

یہ دولت بھی لے لو، یہ شہرت بھی لے لو

یہ دولت بھی لے لو ، یہ شُہرت بھی لے لو
بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی
مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون
وہ کاغذ کی کشتی ، وہ بارش کا پانی

محلے کی سب سے نشانی پُرانی
وہ بُڑھیا جسے بچے کہتے تھے نانی
وہ نانی کی باتوں میں پریوں کا ڈیرہ
وہ چہرے کی جُھریوں میں صدیوں کا پھیرا
بُھلائے نہیں بھول سکتا ہے کوئی
وہ چھوٹی سی راتیں ، وہ لمبی کہانی
وہ کاغذ کی کشتی ، وہ بارش کا پانی
کڑی دھوپ میں اپنے گھر سے نکلنا
وہ چڑیاں ، وہ بلبل ، وہ تتلی پکڑنا
وہ گُڑیوں کی شادی پہ لڑنا جھگڑنا
وہ جھولوں سے گرنا ، وہ ِگرتے سنبھلنا
وہ پیتل کے چھلّوں کے پیارے سے تحفے
وہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی نشانی
وہ کاغذ کی کشتی ، وہ بارش کا پانی

کبھی ریت کے اُونچے ٹیلوں پہ جانا
گھروندے بنانا ، بنا کے مٹانا
وہ معصوم چاہت کی تصویر اپنی
وہ خوابوں ، کھلونوں کی جاگیر اپنی
نہ دُنیا کا غم تھا ، نہ رشتوں کے بندھن
بڑی خوب صورت تھی وہ زندگانی
وہ کاغذ کی کشتی ، وہ بارش کا پانی

یہ دولت بھی لے لو ، یہ شُہرت بھی لے لو
بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی
مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون
وہ کاغذ کی کشتی ، وہ بارش کا پانی

☆☆☆☆☆

سراج الدین ایمن

پیدائش: 1898ء ...... لاہور، انڈیا

وفات: 9۔جنوری، 1990ء ...... لاہور، پاکستان

سراج الدین ایمن کے والد عبداللہ، پٹی لاہور (جو آج کل امرتسر کی تحصیل ہے) میں مدرّس تھے۔ پھر عبداللہ برما چلے گئے اور وہاں ایک سکول کے ہیڈ ماسٹر بن گئے اور وہیں قیام کے دوران اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایمن 1947ء میں اپنا قصبہ ہندوستان میں شامل ہو جانے کی وجہ سے لاہور کے اُس حصہ میں آ گئے جو پاکستان بن چکا تھا۔ اُنھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے او۔ٹی کا امتحان یوں پاس کیا کہ یونیورسٹی میں دوم آئے۔ ازاں بعد گورنمنٹ ہائی سکول کُھڈیاں میں بحیثیت او۔ٹی۔ تعینات ہو گئے۔ آپ نے تمام عمر درس و تدریس اور شعر و شاعری میں گزاری۔

آپ کی اولاد میں محمد علی جوہر، محمد حسین آزاد اور زبیدہ بیگم درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ محمد حسین آزاد ٹیچرز یونین لاہور کے صدر رہے اور منٹو سے (بقول آزاد) فحش نگاری کی وجہ سے ان کی مقدمہ بازی رہی۔

ایمن کے حضرت علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری سے گہرے مراسم تھے اور اُن سے بہت متأثر تھے۔ آیئے اُن کی نظم پڑھتے ہیں:

'بیوی مرحومہ کی یاد میں'

بیوی مرحومہ کی یاد میں

آہ! اے میری رفیقہ ، میری دم سازِ حیات
میرے ارمانوں کی دُنیا، میری ہمرازِ حیات
آہ! اے سرچشمۂ صدق و صفا ، مہر و وفا
مُدَّعائے دردِ دل ، اے پیکرِ لُطف و عطا
محرمِ جاں ، اے مِری دل سوز و غم خوارِ حیات
تیری رنگینی سے تھی میری بہارِ کائنات
حُسن جس سے جذبۂ اُلفت کی ہوتی ہے نمود
عشق جس سے حُسن کو ملتی ہے اِک قدرِ وجود
تھے ہمارے واسطے دونوں ہی مصروفِ عمل
پھر ہماری زندگی میں کوئی کیوں آتا خلل
حُسن سے تیرے مِرا ثابت قدم ایمان تھا
عشق میرا تیری ساری راحتوں کی جان تھا
تُو مِرے ظلمت کدے میں آئی تھی بن کر چراغ
ہو گیا حاصل ہمیں تھا ساری دُنیا کا فراغ
جاں فزا تھے تیرے لبریزِ مسرّت قہقہے
شاخِ گُل پر جیسے بُلبل کے پیارے چہچہے
بھول کر بھی غم ہمارے پاس آ سکتا نہ تھا
عیش کا جو وقت آتا ، آ کے جا سکتا نہ تھا

میں تھا زندہ ، تیرے دم سے گھر مِرا آباد تھا
غم سے تھا ناآشنا ، ہر رنج سے آزاد تھا
آہ! غالب تھی کشش حورانِ جنت کی مگر
اپنی اِک ہم جنس مجھ سے لے گئی ہیں چھین کر
موت کے خاموش بم میں کوئی زیر و بم نہیں
کب یہ پھٹتا ہے کہیں ؟ آگاہ اِس سے ہم نہیں
ناگہاں آئی اجل ، عقبیٰ میں تجھ کو لے گئی
مجھ کو تنہا چھوڑ کر ہے داغِ فرقت دے گئی
رہ گئی احباب کے دل میں ہے تیری یاد ، دیکھ
گھر تِرا جانے سے تیرے ہو گیا برباد ، دیکھ
مِٹ نہیں سکتا مِرے دل سے تِرا نقشِ وفا
یاد میں تیری مقدر بن گیا رونا مِرا
ہے یقیں ایمن کو لیکن آخرت کی زندگی
ہوگی ہم دونوں کو حاصل عافیت کی زندگی

☆☆☆☆☆

سرمد صہبائی

پیدائش: 19۔نومبر،1945ء ...... لاہور
آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔

شاعر، ڈرامہ نگار، فلم اور تھیٹر ڈائریکٹر سرمد صہبائی ایک نہایت باصلاحیت فن کار ہیں۔اُنھوں نے اُردو، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں لکھا اور بہت داد حاصل کی۔

سرمد کا پہلا شعری مجموعہ 'ان کہی باتوں کی تھکن' 1976ء میں شائع ہوا۔اُنھوں نے خوب صورت کافیاں بھی لکھیں جو 'نیلی کے سورنگ' کے نام سے 1986ء میں شائع ہوئیں۔'پل بھر کا بہشت'، 'ماہِ عُریاں' اور 'کٹھ پتلیوں کا شہر' آپ کی تخلیقی کاوشیں ہیں جنھیں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

سٹیج کے علاوہ ٹی وی پر بھی ڈرامے پروڈیوس کیے۔ان میں 'بچوں کا پارک'، 'نیا قانون'، 'آخری دن'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور 'سوگندھی' شامل ہیں۔

اُن کے مجموعے 'ماہِ عُریاں' سے ایک نظم نذرِ قارئین ہے جو سرمد کی شخصیت اور فن کی صحیح نمائندگی کرتی ہے اور لوگ اسے پڑھنا پسند کرتے ہیں۔

پورٹریٹ

(پاک ٹی ہاؤس کے سامنے ایک فقیر عورت کے لیے نظم)

تُو اِس شہر کی پاگل روح ہے
اِک ڈائن ہے جس کا سایہ
فٹ پاتھوں کی گود میں پلتی نسلوں پر
پیدا ہوتے ہی منڈلانے لگتا ہے
روشنیوں کی اوٹ میں آتے جاتے لوگ
تقدیسوں کی چادر اوڑھے
تیری کھلی ہوئی رانوں کی رحل پہ
فحش سخاوتیں دھر جاتے ہیں
خالی پیٹ کی کھوہ میں مُردہ بچوں کو دفنا جاتے ہیں
تیرے چہرے کی دہشت میں
بھوکے ملکوں کے نقشے ہیں
آنکھیں دو پتھریلے لفظ ہیں
جنھیں کوئی شاعر نہیں پڑھتا
تیری سانسیں شہر کی گلیوں بازاروں میں
زخمی گھور پرندے بن کر
بھٹک رہی ہیں
ننگے سینے کی شاخوں سے
گونگی نظمیں لٹک رہی ہیں

☆☆☆☆☆☆

سلام مچھلی شہری

پیدائش: یکم جولائی، 1921ء ...... مچھلی شہر، یو۔ پی، انڈیا

وفات: 19۔نومبر، 1972ء .... دہلی، انڈیا

عبدالسلام، سلام مچھلی شہری صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکے لیکن الٰہ آباد یونیورسٹی کی ملازمت نے اُنھیں اُردو، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور بخش دیا۔ اُن کی بہت سی غزلیں جگجیت سنگھ جیسے صفِ اوّل کے گلوکار نے گائیں۔ اُن کی نظموں کا انتخاب اردو اکیڈمی دہلی نے 1996ء میں 'انتخابِ سلام مچھلی شہری' کے نام سے شائع کیا۔ اُنھیں بھارتی حکومت کی طرف سے پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔

1933ء میں سلام نے لائبریری کی ملازمت چھوڑ دی اور آل انڈیا ریڈیو پر بطور سکرپٹ رائٹر کام کا آغاز کیا۔ وہاں اُنھوں نے پروڈیوسر کے عُہدے تک ترقی پائی۔ اِس دوران بہت عمدہ شعر تخلیق کیا۔

اُن کی نظم 'تمھیں ہم یاد آئیں گے' اہلِ ذوق کو دعوتِ مطالعہ دیتی ہے۔

تمھیں ہم یاد آئیں گے

یکایک خود ہی جب گھبرا کے تم پردہ اُٹھاؤ گے
مجھے اِس عالمِ فانی میں اِک دن جب نہ پاؤ گے
کبھی جب عالمِ تخیل میں تم ڈوب جاؤ گے
کبھی جب اپنی تنہائی پہ خود آنسو بہاؤ گے

تمھیں ہم یاد آئیں گے ، تمھیں ہم یاد آئیں گے

نشاں پوچھو گے جب پامال و بوسیدہ مزاروں سے
پتہ پوچھو گے جب میرا فلک کے چاند تاروں سے
تصور میں جو گزرو گے کبھی دل کش نظاروں سے
پہاڑوں ، وادیوں سے ، ندیوں سے ، آب شاروں سے

تمھیں ہم یاد آئیں گے ، تمھیں ہم یاد آئیں گے

کبھی جب دل نشیں کلیاں بہم شادی رچائیں گی
چمن میں رقص کو جب تتلیاں سج دھج کے آئیں گی
یہ کلیاں ، ہاں یہ دوشیزائیں جب شادی رچائیں گی
ہوائیں جب کوئی بھولا ہوا نغمہ سُنائیں گی

تمھیں ہم یاد آئیں گے ، تمھیں ہم یاد آئیں گے

بنانے کے لیے بیٹھو گے جب پھولوں کا اِک گجرا
یکا یک خود ہی جب ہر بار دھاگا ٹوٹ جائے گا
نظر میں خار ہو جائیں گے جب گُل ہائے حُسن افزا
پہنائے گا تصور جب مِرے اشکوں کی اِک مالا

تمھیں ہم یاد آئیں گے ، تمھیں ہم یاد آئیں گے

☆☆☆☆☆

سلیم احمد

پیدائش: 27۔نومبر، 1927ء ...... بارہ بنکی، یو۔پی، بھارت

وفات: یکم ستمبر، 1983ء .... کراچی، پاکستان

اُردو کے اِس مشہور و معروف نقاد، شاعر، ڈرامہ نویس اور کالم نگار نے مختصر عمر پائی لیکن خود کو زندہ رکھنے کے لیے اردو قارئین کے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے۔

سلیم احمد نے بارہ بنکی سے میٹرک پاس کیا اور پھر میرٹھ کالج میں داخل ہوئے جہاں پروفیسر کرّار حسین، محمد حسن عسکری، انتظار حسین اور ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے بڑے لوگوں سے تعلقات اُستوار ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد کراچی منتقل ہو گئے اور 1950ء میں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔

تنقید میں آپ کے ذہن و قلم بہت زرخیز تھے۔ 'ادبی اقدار'، 'نئی نظم اور پورا آدمی'، 'غالب کون'، 'ادھوری جدیدیت'، 'اقبال ایک شاعر'، 'محمد حسن عسکری آدمی یا انسان' آپ کی تنقیدی خدمات کے طور پر یاد رکھی جائیں گی۔ خواجہ رضی حیدر کا تحقیقی کام، سلیم احمد مشاہدے، مطالعے اور تأثرات کی روشنی میں' سلیم احمد کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرتا ہے۔ شاعری میں سلیم احمد نے اپنے چاہنے والوں کو 'بیاض'، 'اکائی'، 'چراغِ نیم شب' اور 'مشرق' عطا کیں۔

مشرق دو فصلوں اور اُنیس (۱۹) طویل نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے جس میں 'مشرق ہار گیا' محوری حیثیت رکھتی ہے۔ افتخار عارف کہتے ہیں کہ "میرے خیال میں یہ نظم نہ صرف اِس مجموعے کی بلکہ ہمارے عہد کی بہترین طویل نظموں میں منفرد مقام رکھتی ہے"۔ سراج منیر کہتے ہیں کہ "اگر مجھ سے اُردو کی پانچ اہم ترین نظموں کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو میں تین اقبال کی، ایک مسدّس حالی اور پانچویں 'مشرق ہار گیا' کا انتخاب کروں گا"۔

آیئے پڑھتے ہیں: 'مشرق ہار گیا'

مشرق ہار گیا

کپلنگ نے کہا تھا

''مشرق، مشرق ہے

اور مغرب مغرب ہے

اور دونوں کا ملنا ناممکن ہے''

لیکن مغرب، مشرق کے گھر آنگن میں آ پہنچا ہے

میرے بچوں کے کپڑے لندن سے آتے ہیں

میرا نوکر بی بی سی سے خبریں سُنتا ہے

میں بیدلؔ اور حافظؔ کے بجائے

شیکسپیئر اور رلکے کی باتیں کرتا ہوں

اخباروں میں

مغرب کے چکلوں کی خبریں اور تصویریں چھپتی ہیں

مجھ کو چٹّی داڑھی والے اکبرؔ کی کھسیانی ہنسی پر

.... رحم آتا ہے

اقبال کی باتیں (گستاخی ہوتی ہے)

.... مجذوب کی بڑ ہیں

وارثؔ شاہ اور بُلھےؔ شاہ اور بابا فریدؔ

چلیے جانے دیجئے ان باتوں میں کیا رکھا ہے

مشرق ہار گیا ہے!
یہ بکسر اور پلاسی کی ہار نہیں ہے
ٹیپو اور جھانسی کی رانی کی ہار نہیں ہے
سن ستاون کی جنگِ آزادی کی ہار نہیں ہے
ایسی ہار تو جیتی جا سکتی ہے (شاید ہم نے جیت بھی لی ہے)
لیکن مشرق اپنی روح کے اندر ہار گیا ہے

قبلا خاں تم ہار گئے ہو!
اور تمھارے ٹکڑوں پر پلنے والا لالچی مارکو پولو
.... جیت گیا ہے
اکبرِ اعظم! تم کو مغرب کی جس عیارہ نے تحفے بھیجے تھے
اور بڑا بھائی لکھا تھا
اُس کے کُتّے بھی اُن لوگوں سے افضل ہیں
جو تمھیں مہابلی اور ظلِ اللہ کہا کرتے تھے،

مشرق کیا تھا؟
جسم سے اوپر اٹھنے کی اک خواہش تھی
شہوت اور جبلّت کی تاریکی میں
اک دیا جلانے کی کوشش تھی!
میں سوچ رہا ہوں، سورج مشرق سے نکلا تھا
(مشرق سے جانے کتنے سورج نکلے تھے)

لیکن مغرب ہر سورج کو نگل گیا ہے

''میں ہار گیا ہوں''

.... میں نے اپنے گھر کی دیواروں پر لکھا ہے

''میں ہار گیا ہوں''

میں نے اپنے آئینے پر کالک مل دی ہے

اور تصویروں پر تھوکا ہے

ہارنے والے چہرے ایسے ہوتے ہیں

میری روح کے اندر اِک ایسا گہرا زخم لگا ہے

جس کے بھرنے کے لیے صدیاں بھی ناکافی ہیں

میں اپنے بچے اور کتّے دونوں کو ٹیپو کہتا ہوں

مجھ سے میرا سب کچھ لے لو

اور مجھے اِک نفرت دے دو

مجھ سے میرا سب کچھ لے لو

اور مجھے اِک غصّہ دے دو

ایسی نفرت، ایسا غصّہ

جس کی آگ میں سب جل جائیں

.... میں بھی!!

☆☆☆☆☆

سید محمد مبارک شاہ

پیدائش: یکم جنوری، 1961ء ...... چکوال، پاکستان

وفات: 27۔جون،2015ء ...... راولپنڈی، پاکستان

سیّد محمد ولایت شاہ کے ہاں جنم لینے والے مبارک شاہ واپڈا میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمن) بھرتی ہوئے۔ ازاں بعد سی ایس ایس کی بنیاد پر پاکستان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس میں مختلف مناصب پر فائز رہے۔ مبارک شاہ نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ ان کے شعری مجموعے
'جنگل گمان کے' 1993ء میں، 'ہم اپنی ذات کے کافر' 1995ء میں اور 'مدارِ نارسائی میں' 1998ء میں شائع ہوئے۔ اُن کے غیر مطبوعہ کلام کو 'دستک زمین پر' کے عنوان سے کلیاتِ سید مبارک شاہ کا حصہ بنایا گیا ہے۔

ماں کی یاد میں اُن کی نظم قلب پر کیسے واردات کرتی ہے، پڑھ کر دیکھئے:

ماں

اے خدائے زندگانی
مجھے تجھ سے عمرِ فانی
کا گِلہ نہیں ہے لیکن
اے اسیرِ جاودانی
میرا جسم گل رہا ہے
مِری جاں چلی گئی ہے
مجھے ڈھونڈ دے کہیں سے
وہ کہاں چلی گئی ہے
مجھے اُس کے پاس لے جا
وہ جہاں چلی گئی ہے
اے خدائے زندگانی

تُو ازل ازل کا تنہا
میں ابھی ہوا ہوں تنہا
تِرے غم سے دیکھ اب کے
میرا سانحہ بڑا ہے
مِرا درد لادوا ہے
مِرے سر سے دوپہر میں
تِری چھاں چلی گئی ہے
اے خدائے زندگانی
مِری ماں چلی گئی ہے

☆☆☆☆☆

سیف الدین سیف

پیدائش: 20۔جولائی،1922ء ...... امرتسر،انڈیا

وفات: 12۔ جولائی،1993ء ...... لاہور، پاکستان

شاعر، کہانی کار اور فلم ساز سیف الدین سیف نے مثنوی، رباعی، قطعہ، گیت، غزل اور نظم، جو بھی لکھا، خوب لکھا۔ ایم اے او کالج امرتسر میں کالج پرنسپل ایم ڈی تاثیر اور انگریزی کے اُستاد فیض احمد فیض کی قربت نے اُن میں ادبی ذوق پیدا کیا اور پھر سیف نے اُسے نکتۂ کمال تک پہنچایا۔

سیف نے بے شمار فلمی گیت لکھے اور بحیثیت فلم ساز 'سات لاکھ' اور 'کرتار سنگھ' جیسی فلمیں بھی پروڈیوس کیں۔اُن کے یہ نغمے تو آج تک دلچسپی سے سُنے جاتے ہیں:

جلتے ہیں ارمان مِرا دل روتا ہے۔ (انارکلی)

آئے موسم رنگیلے سہانے، جیا نہیں مانے۔ (سات لاکھ)

آج ہے محفل دید کے قابل شمع بھی ہے پروانہ بھی (شمع اور پروانہ)

نظم میں سیف نے بے حد وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا اور نہ صرف پابند نظمیں لکھیں بلکہ نظم آزاد اور نظمِ معریٰ سے بھی کام لیا۔سیف ایک مکمل اور باکمال شاعر تھے۔اُن کی مقبولیت میں کسی گروہ، ادبی تنظیم یا ذرائع ابلاغ کا ہاتھ نہیں تھا۔اُنھوں نے جو لکھا وہ قاری کے دل میں اُترتا چلا گیا۔

اے مِرے شہر (امرتسر کی یاد میں)

اے مِرے شہر تیرے پہلو میں کتنے شاداب دن گزارے ہیں
اب بھی رقصاں مِری نگاہوں میں کمپنی باغ کے نظارے ہیں
دل کو آغوش میں لیے اب تک نہر کے شبنمی کنارے ہیں
جو کبھی رہزنِ دل و جاں تھے آج بھی جان و دل سے پیارے ہیں
تیری دیکھی ہوئی بہاروں کے دل پہ نقشے کئی اُتارے ہیں

کتنی ویران ہو گئیں راتیں
اب نہ وہ چاند ہے نہ تارے ہیں

جن کے سائے دلوں کی ٹھنڈک تھے وہ در و بام یاد آتے ہیں
دھیان پڑتے ہیں آشنا چہرے اجنبی نام یاد آتے ہیں
یاد آتی ہے ہجر کی تلخی وصل کے جام یاد آتے ہیں
کس قدر تہمتیں اُٹھائی تھیں کتنے الزام یاد آتے ہیں
جن کی یادوں کے داغ دُھل نہ سکے وہ دل آرام یاد آتے ہیں

دامنِ دل کے ریگ زاروں میں
غم کے اہرام یاد آتے ہیں

اے مِرے شہر تیرے پہلو میں اوّلیں چوٹ دل پہ کھائی تھی
آرزوؤں کے لالہ زاروں میں غم کی پہلی بہار آئی تھی
تو نے رکھی تھی درد کی بنیاد تو نے تعمیرِ غم اُٹھائی تھی
تو نے بخشا تھا ہجر کا صدمہ تو نے شمعِ وفا جلائی تھی

وصل کی لذتیں نثار اُس پر وہ جدائی بھی کیا جدائی تھی

ہاں مجھے یاد ہے وہ گوشۂ غم

دل کی دولت جہاں لُٹائی تھی

صبح دم بُت کدے کی راہوں میں جمگھٹے وہ پری جمالوں کے

دیکھتے تھے اُبھر اُبھر کے مجھے اونچے اونچے کلس شوالوں کے

وہ تڑپنا تڑپنے والوں کا وہ دلاسے گزرنے والوں کے

وہ تسلّی شریر آنکھوں کی وہ تقاضے خراب حالوں کے

وہ مہکتی ہوئی گزر گاہیں مُشکبو راستے خیالوں کے

اُن کی بادہ فروش آنکھوں میں

سارے انداز تھے غزالوں کے

اے مِرے شہر کتنی اُجلی تھی چاندنی تیرے بوستانوں میں

تنگ راہوں میں نیند کے سائے نیلگوں روشنی مکانوں میں

اور گلیوں میں راہ چلتے ہوئے لوریوں کی صدائیں کانوں میں

ہائے وہ لوگ چلمنوں سے ادھر جیسے کردار ہوں فسانوں میں

سبزہ زاروں میں دن گزرتا تھا رات کٹتی تھی بادہ خانوں میں

اب کہاں وہ نگر کہاں وہ لوگ

رہ گیا ذکر داستانوں میں

وہ چھتوں پر بسنت رُت کا سماں دل سراپا امنگ ہو جائے

گورے گورے بھرے بھرے وہ بدن ہر قبا جن پہ تنگ ہو جائے

ایک آنچل اگر ہوا میں اُڑے روشنی ہفت رنگ ہو جائے

دلِ بے تاب کو اماں نہ ملے شوقِ نظّارہ دنگ ہو جائے

کیا سلیقہ تھا آنکھوں آنکھوں میں صُلح ہو جائے جنگ ہو جائے

ہاتھ انگڑائی کو ذرا جو اُٹھیں

خود وہ کافر پتنگ ہو جائے

لے اُڑی گو ہوائے غم مجھ کو وقت کے تیز رَو سفینے میں

تیری ہر آہ میرے لب پر ہے تیرا ہر زخم میرے سینے میں

تیری مٹی مِرے خمیر میں ہے تیری خوشبو مِرے پسینے میں

کوئی موسم نہ دل کو راس آیا جی نہ بہلا کسی مہینے میں

تجھ میں جو گوہرِ وفا کھویا پھر نہ پایا کسی خزینے میں

اب بھی ہوتے ہیں دل کے داغ ہرے

پھول کھلتے ہیں جس مہینے میں

پھر وہ دن آئے کہ سرِ بازار وحشیوں کے ہجوم لڑنے لگے

اِس طرح تیرگی نے کی یلغار روشنی کے قدم اُکھڑنے لگے

بستیوں میں فساد کے شعلے بے گناہوں کی سمت بڑھنے لگے

جان کا خوف آن کا دھڑکا چاند سے چہرے ماند پڑنے لگے

خاندانوں میں ابتری پھیلی لوگ روتے ہوئے بچھڑنے لگے

جن کی رونق تھی رشکِ باغِ عدن

وہ محلے وہ گھر اُجڑنے لگے

رات روشن تھی سَیلِ آتش سے دن کا چہرہ دُھویں سے کالا تھا

ہر طرف وحشیوں کے لشکر تھے بربریت کا بول بالا تھا

تیغِ قاتل نے کم سِنوں کا لہو در و دیوار تک اُچھالا تھا

کتنی بہنیں تھیں بھائیوں نے جنھیں اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا تھا

اُن کی لاشیں بھی دفن کر نہ سکے ناز و نعمت سے جن کو پالا تھا

بے کسوں نے دعائیں کیں لیکن

اُس گھڑی کون سُننے والا تھا

اِک یقیں تھا خدا تو سُنتا ہے جب کوئی دوسرا نہیں سنتا

لیکن آخر یہ مجھ پہ راز کُھلا کیا وہ سُنتا ہے کیا نہیں سنتا

وہ سمیع و بصیر ہے لیکن بے عمل کی صدا نہیں سُنتا

ڈوبتا ہے جو وقت سے پہلے شورِ موجِ بلا نہیں سُنتا

شہر جل جائیں بستیاں مٹ جائیں غافلوں کی دُعا نہیں سُنتا

فیصلہ ہے یہ دینِ فطرت کا

بُزدلوں کی خدا نہیں سُنتا

قوم پر جب زوال آتا ہے رہنما بے ضمیر ہوتے ہیں

جو خوشامد کے فن میں کامل ہوں وہ مشیر و وزیر ہوتے ہیں

جن کی فردِ عمل ہو اپنی سیاہ وہی منکر نکیر ہوتے ہیں

چُھپتے پھرتے ہیں اُس کے اہلِ ہُنر اہلِ فن گوشہ گیر ہوتے ہیں

مُلک بٹتا ہے فوج کٹتی ہے اُس کے بیٹے اسیر ہوتے ہیں

موت سے چُھپ کے بھاگنے والے

لُقمۂ دار و گیر ہوتے ہیں

ہو گئی خواب نیند راتوں کی دن عجب خوف میں گزرنے لگے

زندگی جن پہ ناز کرتی تھی وہ حسیں زہر کھا کے مرنے لگے

جن پہ مغرور تھی بہار وہ پھول شاخ سے ٹوٹ کر بکھرنے لگے

کفر و ایمان کے تصادم میں بیٹیوں کے لباس اُترنے لگے

ایسا ہمسائے نے سلوک کیا اپنے سائے سے لوگ ڈرنے لگے

بچنے والوں نے وہ سماں دیکھا

مرنے والوں پہ رشک کرنے لگے

اے مِرے شہر اُن دِنوں تُو نے گو ہمیں خستہ حال دیکھا ہے

پھر بھی چشمِ فلک نے صدیوں میں یہ سماں خال خال دیکھا ہے

ہم نہتّے بھی لڑ گئے اکثر تُو نے یہ بھی کمال دیکھا ہے

تیرے جلتے ہوئے دریچوں نے غازیوں کا جلال دیکھا ہے

تُو نے جلتی ہوئی چھتوں کے تلے وہ جدال و قتال دیکھا ہے

راہِ حق میں لُٹا دیا سب کچھ

جان دیکھی نہ مال دیکھا ہے

دل سے جاتا نہیں دُھواں اب تک تیرے جلتے ہوئے مکانوں کا

آج بھی گونجتا ہے کانوں میں شورِ فریاد ناتوانوں کا

موت چھائی ہوئی ضعیفوں پر رنگ اُترا ہُوا جوانوں کا

ماؤں کی چھاتیوں سے لگ لگ کر دل دھڑکتا تھا بے زبانوں کا

دُور تک قافلے غریبوں کے ہائے وہ عزم سخت جانوں کا

موت کی بے بسی نگاہوں میں

پیٹھ پر بوجھ آسمانوں کا

ہائے وہ آخری شبِ وحشت نیند آئی نہ غم کے ماروں کو

ہم نے رُخصت کیا تھا رو رو کر صبح کے ڈوبتے ستاروں کو

ساتھ لاکھوں کے چل دیے ہم بھی بے کفن چھوڑ کر ہزاروں کو

آنکھوں آنکھوں میں کر لیا سجدہ مسجدِ شہر کے مناروں کو

کتنی حسرت سے ہم نے دیکھا تھا سیتلا کے حسیں نظاروں کو

دُور سے آخری سلام کیا اپنے اجداد کے مزاروں کو
روئے لگ کر تِری فصیلوں سے چھوڑ کر تیری رہگزاروں کو
کیا خبر کھا گئی نظر کس کی
تیرے باغوں تِری بہاروں کو

☆☆☆☆☆

وعدہ

اِس سے پہلے کہ تیری چشمِ کرم
معذرت کی نگاہ بن جائے
اِس سے پہلے کہ تیرے بام کا حُسن
رِفعتِ مہر و ماہ بن جائے
پیار ڈھل جائے میرے اشکوں میں
آرزو ایک آہ بن جائے
مجھ پہ آ جائے عشق کا الزام
اور تُو بے گُناہ بن جائے
میں ترا شہر چھوڑ جاؤں گا

اِس سے پہلے کہ سادگی تیری
لبِ خاموش کو گِلہ کہہ دے
میں تجھے چارہ گر خیال کروں
تُو مِرے غم کو لادوا کہہ دے
تیری مجبوریاں نہ دیکھ سکے
اور دل تجھ کو بے وفا کہہ دے
جانے میں بے خودی میں کیا پوچھوں
جانے تُو بے رُخی سے کیا کہہ دے

میں تِرا شہر چھوڑ جاؤں گا

چارۂ درد ہو بھی سکتا تھا
مجھ کو اِتنی خوشی بہت کچھ ہے
پیار گو جاوداں نہیں پھر بھی
پیار کی یاد بھی بہت کچھ ہے
آنے والے دِنوں کی ظُلمت میں
آج کی روشنی بہت کچھ ہے
اِس تہی دامنی کے عالم میں
جو مِلا ہے وہی بہت کچھ ہے
میں تِرا شہر چھوڑ جاؤں گا

چھوڑ کر ساحلِ مراد چلا
اب سفینہ مِرا کہیں ٹھہرے
زہر پینا مِرا مقدر ہے
اور ترے ہونٹ انگبیں ٹھہرے
کس طرح تیرے آستاں پہ رُکوں
جب نہ پاؤں تلے زمیں ٹھہرے
اِس سے بہتر ہے دل یہی سمجھے
تُو نے روکا تھا ہم نہیں ٹھہرے

میں ترا شہر چھوڑ جاؤں گا

مجھ کو اِتنا ضرور کہنا ہے
وقتِ رُخصت سلام سے پہلے
کوئی نامہ نہیں لکھا میں نے
تیرے حرفِ پیام سے پہلے
توڑ لوں رشتۂ نظر میں بھی
تم اُتر جاؤ بام سے پہلے
لے مِری جان میرا وعدہ ہے
کل کسی وقت شام سے پہلے

میں ترا شہر چھوڑ جاؤں گا

☆☆☆☆☆

جب ترِے شہر سے گزرتا ہوں

کس طرح روکتا ہوں اشک اپنے
کِس قدر دل پہ جبر کرتا ہوں
آج بھی کار زارِ ہستی میں!
جب ترِے شہر سے گزرتا ہوں

اِس قدر بھی نہیں مجھے معلوم
کِس محلّے میں ہے مکاں تیرا
کون سی شاخِ گُل پہ رقصاں ہے
رشکِ فردوس ، آشیاں تیرا
جانے کن وادیوں میں اُترا ہے
غیرتِ حُسن ، کارواں تیرا
کس سے پوچھوں گا میں خبر تیری
کون بتلائے گا نشاں تیرا
تیری رُسوائیوں سے ڈرتا ہوں
جب ترِے شہر سے گزرتا ہوں

حالِ دل بھی نہ کہہ سکا ، گرچہ

تُو رہی مُدّتوں قریب مِرے
کچھ تِری عظمتوں کا ڈر بھی تھا
کچھ خیالات تھے عجیب مِرے
آخرِ کار وہ گھڑی آئی
بار ور ہو گئے رقیب مِرے
تُو مجھے چھوڑ کر چلی بھی گئی
خیر! قسمت مِری ، نصیب مِرے
اب میں کیوں تجھ کو یاد کرتا ہوں
جب تِرے شہر سے گزرتا ہوں

گو زمانہ تِری محبت کا
ایک بُھولی ہوئی کہانی ہے
تیرے کُوچے میں عمر بھر نہ گئے
ساری دُنیا کی خاک چھانی ہے
لذّتِ وصل ہو کہ زخمِ فراق
جو بھی ہو ، تیری مہربانی ہے
کس تمنّا سے تجھ کو چاہا تھا
کس محبت سے ہار مانی ہے
اپنی قسمت پہ ناز کرتا ہوں
جب تِرے شہر سے گزرتا ہوں

اشک پلکوں پہ آ نہیں سکتے
دل میں ہے تیری آبرو اب بھی
تجھ سے روشن ہے کائنات مِری
تیرے جلوے ہیں چار سُو اب بھی
اپنے غم خانۂ تخیّل میں
تجھ سے ہوتی ہے گفتگو اب بھی
تجھ کو ویرانۂ تصور میں
دیکھ لیتا ہوں رُوبرو اب بھی
اب بھی میں تجھ کو پیار کرتا ہوں
جب تِرے شہر سے گزرتا ہوں

آج بھی کار زارِ ہستی میں
تُو اگر ایک بار مل جائے
کسی محفل میں سامنا ہو جائے
یا سرِ رہ گزار مل جائے
اِک نظر دیکھ لے محبت سے
ایک لمحے کا پیار مل جائے
آرزوؤں کو چین آ جائے
حسرتوں کو قرار مل جائے
جانے کیا کیا خیال کرتا ہوں
جب تِرے شہر سے گزرتا ہوں

آج میں اُس مقام پر ہوں ، جہاں

رسن و دار کی بلندی ہے
میرے اشعار کی لطافت میں
تیرے کردار کی بلندی ہے
تیری مجبوریوں کی عظمت ہے
میرے ایثار کی بلندی ہے
سب ترے درد کی عنایت ہے
سب ترے پیار کی بلندی ہے
تیرے غم سے نباہ کرتا ہوں
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

تجھ سے کوئی گِلہ نہیں مجھ کو
میں تجھے بے وفا نہیں کہتا
تیرا ملنا خیال و خواب ہوا
پھر بھی ناآشنا نہیں کہتا
وہ جو کہتا تھا مجھ کو آوارہ
میں اُسے بھی بُرا نہیں کہتا
ورنہ اِک بے نوا محبت میں
دل کے لُٹنے پہ کیا نہیں کہتا
میں تو مشکل سے آہ بھرتا ہوں
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

کوئی پُرسانِ حال ہو تو کہوں
کیسی آندھی چلی ہے تیرے بعد
دن گزارا ہے کس طرح میں نے
رات کیسے ڈھلی ہے تیرے بعد
شمعِ اُمید صرصرِ غم میں
کس بہانے جلی ہے تیرے بعد
جس میں کوئی مکیں نہ رہتا ہو
دل وہ سُونی گلی ہے تیرے بعد
روز جیتا ہوں ، روز مرتا ہوں
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

لیکن اے ساکنِ حریمِ خیال!
یاد ہے دورِ کیف و کم کہ نہیں
کیا کبھی تیرے دل پہ گزرا ہے
میری محرومیوں کا غم کہ نہیں
میری بربادیوں کا سُن کر حال
آنکھ تیری ہوئی ہے نم ، کہ نہیں
اور اِس کار زارِ ہستی میں
پھر کبھی مل سکیں گے ہم کہ نہیں
ڈرتے ڈرتے سوال کرتا ہوں
جب ترے شہر سے گُزرتا ہوں

☆☆☆☆☆

شبنم شکیل

پیدائش: 12۔مارچ،1942ء ...... لاہور، پاکستان

وفات: 2۔مارچ،2013ء ...... کراچی، پاکستان

ادیب ، ماہرِ تعلیم اور شاعرہ شبنم شکیل نے کنیئرڈ کالج اور اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے تعلیم حاصل کی اور مختلف کالجز میں اُردو ادب کی اُستاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔آپ معروف شاعر اور نقاد سید عابد علی عابد کی صاحبزادی تھیں۔شاعری میں گہری دلچسپی تھی۔

اُن کے تنقیدی مضامین 1965ء میں اُس وقت شائع ہوئے جب اُن کی عمر صرف 23 برس تھی۔اُنھوں نے اُردو زبان و ادب کی خدمت کرتے متعدد اعزاز حاصل کیے جن میں پرائیڈ آف پرفارمنس بھی شامل ہے، جس سے اُنھیں 2005ء میں نوازا گیا۔

شبنم شکیل نے بہت خوب صورت شاعری کی۔اُن کی نظمیں بہت دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔اُن کا مجموعہ جو مغنیاؤں کا تذکرہ ہے' آواز تو دیکھو' کے عنوان سے شائع ہوا جو بہت مقبول ہوا۔

آیئے اُن کا کچھ کلام پڑھتے ہیں:

تنبیہ

میں جس پھول کو ہاتھ لگاؤں پھول وہ مُرجھا جائے
اِک پل جس دیپک کو دیکھوں وہ دیپک بُجھ جائے
جس پر میں نظریں ڈالوں وہ تارہ ڈوبتا جائے
بیٹھوں پیڑ ہرے کی چھاؤں پیڑ ہی سُوکھتا جائے
میں جو سونے کو چُھولوں تو وہ مٹی بن جائے
تم ہو قسمت والے ، دیکھو
مجھ سے دُور ہی رہنا

☆☆☆☆☆☆

شکیل بدایونی

پیدائش: 3۔اگست،1916ء ...... بدایوں،انڈیا

وفات: 20۔اپریل،1970ء ...... ممبئی،انڈیا

شکیل احمد مسعودی بدایوں کی ایک بڑی مسجد کے پیش امام محمد جمال احمد سوختہ قادری کے فرزند تھے جنھوں نے بیٹے کو بیک وقت عربی، فارسی، اُردو اور ہندی زبانوں کی تعلیم دلوائی۔ جمال احمد سوختہ کو شاعری سے دلچسپی نہ تھی۔ یوں ہندوستان کے دیگر بہت سے شعراء کی طرح شکیل کو شاعری وراثت میں نہ ملی۔ اُن کے پانچ شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں 'صنم وحرم' اور 'رعنائیاں' بہت مقبول ہوئے۔ 1936ء میں جب شکیل علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوا تو وہاں کے ماحول سے اُسے شاعری میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اُس کی شاعری زیادہ تر رومانی ہی رہی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے بہت کامیاب رہا۔ 'بیجو باورا' ،'مغلِ اعظم'، اور 'صاحب، بی بی اور غلام' جیسی مشہور فلموں کے لیے لکھے گئے نغمات نے شکیل کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اُس کے 'او دُنیا کے رکھوالے' (بیجو باورا)، 'پیار کیا تو ڈرنا کیا' (مغلِ اعظم)، 'لو آ گئی اُن کی یاد، وہ نہیں آئے' (دو بدن) جیسے فلمی گیت آج بھی پاک و ہند میں نہایت دلچسپی سے سُنے جاتے ہیں۔ اُس نے ہندوستانی فلم کو دو سو سے زائد فلمی گیت دے کر ایک نام پیدا کیا۔ اُنھیں تین بار فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا اور 2013ء میں بھارت سرکار نے اُن کا یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا۔ نمونہ کلام دیکھیے :

☆ وہی کارواں، وہی راستے، وہی زندگی، وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں، کبھی ہم نہیں

☆ کوئی اے شکیل پوچھے، یہ جنوں نہیں تو کیا ہے
کہ اُسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

اِس مجموعے کے لیے ہم نے اُن کی بہترین نظم 'وہ دَور بھی آیا کرتے تھے' کا انتخاب کیا ہے۔

وہ دَور بھی آیا کرتے تھے

آغازِ محبت میں اکثر
وہ دَور بھی آیا کرتے تھے
میں اُن میں سمایا کرتا تھا
وہ مجھ میں سمایا کرتے تھے

جب جور و ستم کے رُخ پر
تھا لُطف و عنایت کا غازہ
جب دل کو بھی کرنا مشکل تھا
جذباتِ دروں کا اندازا

جب پھولوں سے نازک دل پہ
تھا زخمِ نظر تازہ تازہ
اِک بار تبسم فرما کر
سو بار ہنسایا کرتے تھے

احساس کی شمعیں جلتی ہیں
جب ناز و ادا کی محفل میں
رکھا تھا قدم مدہوشی نے
جب ہوش و خرد کی منزل میں

جب فتحِ محبت پر اپنی
مغرور تھے ہم دل ہی دل میں
وہ اور نظر کی شہ دے کر
مغرور بنایا کرتے تھے

ہیں یاد ابھی تک دل کو مِرے
اُن کی وہ عنایاتِ پیہم
ہر لمحہ وہ احساسِ وفا
ہر لحظہ وہ صد اندازِ کرم

وہ عشق و تمنا کی دُنیا
وہ حُسن و محبت کا عالم
جھکتی تھی نظر سجدے کے لیے
جب سامنے آیا کرتے تھے

درپیش ہو دردِ ہجر کبھی
جب غم کا تقاضا ہوتا تھا
اُس دَورِ جُدائی میں کس کو
پھر صبر کا یارا ہوتا تھا

یوں گرمیِ ربطِ باہم سے
فُرقت کا مداوا ہوتا تھا
ملنے کو خود آیا کرتے تھے
یا مجھ کو بلایا کرتے تھے

انجم کی جھلک ، اختر کی ضیا
راتوں کو منور کرتی تھی
پھولوں کی مہک ، غنچوں کی ادا
ہستی کو معطر کرتی تھی

سازوں کی جھمک ، نغموں کی صدا
عالم کو مسحّر کرتی تھی
نغماتِ حسیں سے ہم دونوں
فطرت کو جگایا کرتے تھے

بُھولوں گا ، نہ بھولا ہوں اب تک
رُخصت کا غم آگیں افسانہ
منہ پھیر کے میری جانب سے
آنکھوں میں آنسو بھر لانا

پھر خود ہی دبی آواز سے کچھ
تسکین کے جملے فرمانا
سَو حشر بھی ہو جس پر قرباں
وہ حشر اُٹھایا کرتے تھے

وہ بات کہاں فصلِ گُل میں
وہ لُطف کہاں برساتوں میں
اِک بار نہیں ، ہر بار سحر
ہو جاتی تھی باتوں باتوں میں
تصدیقِ محبت کا عالم
دُنیا کو دِکھایا کرتے تھے

بے تاب جدائی میں اُن کی
جب اپنی طبیعت ہوتی تھی
کچھ اُن کے خطوطِ رنگیں سے
تسکینِ محبت ہوتی تھی

آنکھوں سے دِلاسے دے دے کر
پوشیدہ وہ صورت ہوتی تھی
تصویر کو فرطِ شوق میں ہم
سینے سے لگایا کرتے تھے

ہاں اب یہ حقیقت ہی نہ رہی
ہاں اب یہ فسانہ ہی نہ رہا
ہر چند وہی ہیں ہم دونوں
لیکن وہ زمانہ ہی نہ رہا

تاثیر بلائیں لیتی تھی
جب ہاتھ اُٹھایا کرتے تھے

☆☆☆☆☆

عابی مکھنوی

پیدائش:5۔جنوری،1976ء ...... ہری پور ہزارہ، پاکستان

کراچی میں بقیدِ حیات ہیں۔

عابی مکھنوی درس وتدریس سے منسلک 46 سال کے جوان اور دردِ دل رکھنے والے انسان ہیں۔ ہری پور میں پیدا ہوئے لیکن آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔سوسائٹی کے زیر و بم کا مکمل فہم و ادراک رکھتے ہیں اور نا انصافی پر واویلا بھی مچاتے ہیں۔ایک شعر دیکھیے :

☆ روز سہتی ہیں جو کوٹھوں پہ ہوس کے نشتر
ہم درندے جو نہ ہوتے تو وہ مائیں ہوتیں

آپ اُن شعراء میں سے ہیں کہ شعر کے قارئین جن کے کلامِ نَو کے منتظر رہتے ہیں۔ اُن کی نظم 'پردیس' عام آدمی کی شاعری ہے جسے بہت سے لوگوں نے تحت اللفظ پڑھنے میں فخر محسوس کیا، جن میں ڈاکٹر شائستہ ٹی وی اینکر بھی شامل ہیں، لیکن ہم نے اِس مجموعے کے لیے اُن کی نظم 'بابا جانی' کا انتخاب کیا ہے کہ یہ نہ صرف 'پردیس' سے بلکہ عدالتی نظام پہ اُن کی خوں رُلا دینے والی نظم سے بھی زیادہ تاثیر رکھتی ہے۔

بابا جانی

بستر پر بیمار پڑے تھے
بابا جانی کروٹ لے کر
ہلکی سی آواز میں بولے
بیٹا کل کیا منگل ہوگا
گردن موڑے بِن میں بولا
بابا کل تو بُدھ کا دن ہے
بابا جانی سُن نہ پائے
پھر سے پوچھا کل کیا دن ہے
تھوڑی گردن موڑ کے میں نے
لہجے میں کچھ زہر ملا کے
مُنہ کو کان کی سیدھ میں لا کے
دھاڑ کے بولا

بُدھ ہے بابا .... بُدھ .... بُدھ ہے بابا
آنکھوں میں دو موتی چمکے
سُوکھے سے دو ہونٹ بھی لرزے
لہجے میں کچھ شہد ملا کے
بابا بولے بیٹھو بیٹا
چھوڑو دن کو دن ہیں پورے

تم میں میرا حصہ سُن لو، بچپن کا اِک قصّہ سُن لو
یہی جگہ تھی میں تھا تم تھے،
تم نے پوچھا رنگ برنگے، پھولوں پر یہ اُڑنے والی
اِس کا نام بتاؤ بابا
گال پہ بوسہ دے کر میں نے، پیار سے بولا تتلی بیٹا
تم نے پوچھا کیا ہے بابا؟ پھر میں بولا تتلی بیٹا
تتلی تتلی کہتے سُنتے، ایک مہینہ پُورا گزرا
ایک مہینہ پوچھ کے بیٹا
تتلی کہنا تم نے سیکھا
ہر اِک نام جو سیکھا تم نے
کتنی بار وہ پوچھا تم نے
تیرے بھی تو دانت نہیں تھے
میرے بھی اب دانت نہیں ہیں
تیرے پاس تو بابا تھے نا
باتیں کرتے کرتے تُو تو
تھک کے گود میں سو جاتا تھا
تیرے پاس تو بابا تھے نا، میرے پاس تو بیٹا ہے نا
بوڑھے سے اِس بچے کے بھی
بابا ہوتے سُن بھی لیتے
تیرے پاس تو بابا تھے نا
میرے پاس تو بیٹا ہے نا
میرے پاس تو بیٹا ہے نا!

☆☆☆☆☆

عادل منصوری

پیدائش: 18۔مئی،1936ء ...... احمد آباد،انڈیا

وفات: 6۔نومبر،2008ء ...... نیوجرسی،امریکہ

فرید محمد غلام نبی، عادل منصوری نے ہندی، اردو اور گجراتی میں شاعری کی۔آپ بہترین خطاط، پینٹر اور ڈرامہ نگار بھی تھے۔قیامِ پاکستان کے وقت ہجرت کر کے کراچی چلے گئے لیکن 1955ء میں اپنے خاندان کے ساتھ واپس احمد آباد لوٹ گئے۔ وہاں 1960ء میں جدیدیت کے نمائندہ رسالے 'شب خون' سے وابستہ ہوئے جہاں اُن کی سینکڑوں غزلیں اور نظمیں شائع ہوئیں۔ 1985ء میں بھارت چھوڑ کر امریکہ چلے گئے لیکن پاکستان یا بھارت سے رشتہ توڑ دینے کے باوجود اُردو ادب سے اُنھوں نے اپنا تعلق ٹوٹنے نہ دیا۔

عادل منصوری مذہب سے لگاؤ رکھتے تھے اور تاریخِ اسلام اور سیرت النبیؐ میں گہری دلچسپی تھی۔

'تبوک آواز دے رہا ہے'

کا شمار ان کی انتہائی خوب صورت نظموں میں ہوتا ہے اور سیرت کے طالب علم اِسے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

تبوک آواز دے رہا ہے

تبوک آواز دے رہا ہے
زمیں سے اب جو چپک رہے گا
منافقوں میں شمار ہوگا
لہو کے سورج کی لال آنکھیں
اُداس لمحوں کو سونگھتی ہیں
کھجور پکنے کا وقت بھی ہے
سواریاں اور سفر کا سامان ساتھ لے لو
خدا بڑا ہے .... بہت بڑا ہے .... خدا بڑا ہے
تمھارے اُونٹوں کی گردنوں سے
تمام دُنیا میں نور پھیلے
تمھارے گھوڑوں کی ہنہناہٹ
تمھاری منزل کی راہ کھولے
بلندیوں کی طرف بلاتا ہے آج کوئی
یہ دھوپ سائے کے ساتھ ہوگی
ہوا میں ہنستا نشان دیکھو
وہ اُڑتے پرچم کی شان دیکھو
ابھی ابھی قافلہ گیا ہے .... تبوک آواز دے رہا ہے
میں اپنے گھوڑے کی باگ موڑوں
میں اپنے گھر کی طرف نہ جاؤں

☆☆☆☆☆

عبدالحمید عدم

پیدائش: 10۔اپریل،1910ء ...... تلونڈی موسیٰ خان، گوجرانوالہ، پاکستان

وفات: 10۔مارچ،1981ء ...... لاہور، پاکستان

عدم گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے لیکن ابتدائی زندگی میں ہی لاہور چلے گئے اور میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور سے پاس کیا۔ ایف اے کا امتحان پرائیویٹ ہی پاس کیا اور ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد راولپنڈی ٹرانسفر ہو گئے اور 1966ء میں اسی محکمہ سے ریٹائر ہوئے۔ عدم نے شاعری کے میدانِ خارزار میں اُس وقت قدم رکھا جو جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کا دور تھا لیکن عدم اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ عدم نے بھی اُن کی طرح رومانی شاعری ہی کی۔

عدم نے بہت لکھا اور اُن کے بہت سے شعری مجموعے شائع ہوئے لیکن 'خرابات'، 'نگارخانہ'، 'چارۂ درد' اور 'رمِ آہو' زیادہ مشہور ہوئے۔ اُنھوں نے عمر خیام کی رباعیات کا اُردو ترجمہ بھی کیا جو بہت مقبول ہوا۔

عدم کے دو خوب صورت اشعار:

☆ کہتے ہیں عمرِ رفتہ کبھی لَوٹتی نہیں

جا مَے کدے سے میری جوانی اُٹھا کے لا

☆ بارش شرابِ عرش ہے یہ سوچ کر عدم

بارش کے سب حروف کو اُلٹا کے پی گیا

محبّت

اے میری وضع دار محبوبہ

شام کے وقت قہوہ خانے میں
جن نگاروں نے ہم کو دیکھا ہے
اور جن کے حریص شیدائی!
رات دن اُن کے ساتھ رہتے ہیں
وہ طرح دار لڑکیاں اکثر
پوچھتی ہیں یہ مجھ سے ہنس ہنس کر
جس پہ تم جاں نثار کرتے تھے
آج کل کیوں نظر نہیں آتی

اے میری وضع دار محبوبہ

کیا کہوں اِن عجیب لوگوں سے
اپنی حالت پہ مسکراتا ہوں
تیری چھوٹی سی زود رنجی سے
حادثہ بن گئی ہے میری حیات
اِن میں ایسی بھی نازنینیں ہیں
جو مِرے حال پر ترس کھا کر
دیکھتی ہیں بڑی مروّت سے

جن کی آنکھوں کی مست جھیلوں میں
تیرنا چاہتا ہے طائرِ دل
آہ! لیکن اُنھیں کہاں معلوم
کہ محبت کا سوزِ لافانی
بددعا ہے بخیل فطرت کی
ان کے نزدیک دن جوانی کے
سبز و شاداب شامیانے ہیں
اور گل بار شامیانوں سے
ہیں معلّق بہار کے جھولے
ان کو اِس حادثے کا علم کہاں
کہ کئی پھول نوجوانی میں
شاخِ ہستی پہ سوکھ جاتے ہیں
اور مشکل سے مسکراتے ہیں

☆☆☆☆☆

عرش صدیقی

پیدائش: 21۔جنوری، 1927ء ...... گورداس پور، انڈیا

وفات: 8۔اپریل، 1997ء .... ملتان، پاکستان

شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور انگریزی ادب کے اُستاد ارشاد الرحمٰن ،عرش صدیقی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ انگریزی کے پہلے سربراہ تھے۔ اُن کا افسانوی مجموعہ 'باہر کفن سے پاؤں' بہت مقبول ہوا۔ اُن کے پانچ شعری مجموعے 'دیدۂ یعقوب'، 'محبت لفظ تھا میرا' 'ہر موج ہوا تیز' اور 'اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے' شائع ہو چکے ہیں۔ اُنھوں نے پنجابی بھی لکھی اور ایک مجموعہ 'کالی رات دے گھنگرو' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اُن کے تنقیدی مضامین کے تین مجموعے بھی اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ اُن کی غزل کے دو اشعار دیکھیئے:

☆ لب سی کے مِرے تُو نے دیے فیصلے سارے

اک بار تو بے درد سُنا چاہیے مجھ کو

☆ سب ختم ہوئے چاہ کے اور ضبط کے قصے

اب پوچھنے آئے ہو کہ کیا چاہیے مجھ کو

عرش صدیقی کی اصل پہچان اُن کی نظم بنی۔ اُنھوں نے بہت خوب صورت نظمیں لکھیں جنھیں اُردو شعر کے قارئین سے بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ اُن کی ایک نظم 'اُسے کہنا' بہت مقبول ہے۔ آیئے پڑھتے ہیں:

اُسے کہنا

اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے

دسمبر کے گزرتے ہی برس اِک اور ماضی کی گپھا میں ڈوب جائے گا

اُسے کہنا دسمبر لوٹ آئے گا

مگر جو خون سو جائے گا جسموں میں نہ جاگے گا

اُسے کہنا ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کے کہرے دیواروں میں لرزاں ہیں

اُسے کہنا شگوفے ٹہنیوں میں سو رہے ہیں

اور اُن پر برف کی چادر بچھی ہے

اُسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا

تو کیسے برف پگھلے گی

اُسے کہنا کہ لوٹ آئے

☆☆☆☆☆

عرش ملسیانی

پیدائش: 20۔ستمبر، 1908ء ...... ملسیان، پنجاب، انڈیا
وفات: 15۔دسمبر، 1979ء .... دِلّی، انڈیا

پنڈت بالمکند عرش ملسیانی اُردو کے ممتاز شاعر جوش ملسیانی کے فرزند تھے۔ادبی رسالے 'آج کل' کے نائب مدیر تھے۔یوں سات سال جوش ملیح آبادکے رفیقِ کار رہے۔جوش کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد 'آج کل' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

'ہفت رنگ' اور 'رنگ و آہنگ' اُن کے شعری مجموعے ہیں۔آپ نے مزاح بھی لکھا اور یوں مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'پوسٹ مارٹم' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔عمر خیام کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ کیا جو 'ہست و بود' کے نام سے شائع ہوا۔

عرش نے نظم 'جنت کشمیر یہی ہے' کب اور کس تناظر میں لکھی، اس سے قطع نظر یہ لائقِ قرأت کلام ہے۔ہم اسے آج کے تناظر میں پڑھیں گے۔'مزدور' اور 'بیوہ کی فریاد' بھی عرش کی شخصیت کی بہترین عکاس ہیں اور اُردو شاعری کے قارئین کے لیے کسی تحفہ سے کم نہیں ہیں۔

بیوہ کی فریاد

کسی کی یاد دل میں ہے کہ جس سے جی نڈھال ہے
کہوں اگر تو کیا کہوں عجب طرح کا حال ہے
نہ وہ زمیں نہ وہ فلک نہ اب وہ کائنات ہے
وہ زندگی ہی اب نہیں نہ دن ہے وہ نہ رات ہے
وہ آرزو ہے کون سی جو آج پا بہ گل نہیں
ہے نام دل کا دل مگر جو سچ کہوں تو دل نہیں
گھٹا اُٹھی تو ہے مگر پپیہا آج گائے کیا
تڑپ مِری مٹائے کیا لگی مِری بجھائے کیا
وہ پریم سے بھرے بچن کہ جن سے کان آشنا
وہ مست آنکھ مدھ بھری کہ جس سے جان آشنا
وہ بات بات پر ہنسی وہ چھیڑ پیار پیار میں
قرار اِک تڑپ میں وہ تڑپ وہ اِک قرار میں
کبھی اِدھر سے تاکنا کبھی اُدھر سے دیکھنا
وہ میرے دل کے شوق کو میری نظر سے دیکھنا
غرض وہ دن کہ جب مِرے چمن میں اِک بہار تھی
غرض وہ دن کہ جب خوشی مِرے لیے سنگھار تھی
غرض وہ دن کہ نغمہ زن مسرتوں کا ساز تھا
غرض وہ دن کہ حُسن جب مِرا نظر نواز تھا

غرض وہ دن کہ جب سے دل نشان غم کا دور تھا
غرض وہ دن کہ آنکھ میں بھرا ہوا سرور تھا
غرض وہ دن کہ میں بھی جب کسی کے دل کا ناز تھی
غرض وہ دن نیاز کے کہ جب میں بے نیاز تھی
غرض وہ دن خیال تھا کہ اب نہ جائیں گے کبھی
چلے گئے کچھ اس طرح کہ پھر نہ آئیں گے کبھی
غضب یہ ہے شباب میں مِرا سہاگ لُٹ گیا
سفر میں تھا جو ہم سفر اُسی کا ساتھ چُھٹ گیا
یہ سچ ہے مجھ غریب کا کوئی رفیق اب نہیں
یہ سچ ہے غم نصیب کا کوئی شفیق اب نہیں
فغاں میں اب وہ جوش ہے کہ جس کی انتہا نہیں
جگر میں اب وہ درد ہے کہ جس کی کچھ دوا نہیں
خیال ہے خزاں میں بھی مجھے اُسی بہار کا
غضب ہے چھوڑتا نہیں فریب انتظار کا
اجل کی ایک شکل ہے یہ درد اِس بلا کا ہے
دَوا کروں تو کیا کروں کہ وقت اب دُعا کا ہے
مِری طرح نہ زندگی کسی کی یوں عجیب ہو
نصیب موت ہو اگر تو زندگی نصیب ہو

☆☆☆☆☆

جنتِ کشمیر یہی ہے

جس خاک کی ہے اوج پہ تقدیر یہی ہے
جو رد غلامی کی ہے اکسیر یہی ہے
بیداریٔ جمہور کی تصویر یہی ہے
آزادیٔ افراد کی تعمیر یہی ہے
اے عرشؔ ترے خواب کی تعبیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے

اس سے نہیں اچھا کوئی گلزار اسے دیکھ
اس سے نہیں بڑھ کر کوئی شہکار اِسے دیکھ
اس سے نہیں اُونچا کوئی دربار اِسے دیکھ
اِس سے نہیں بہتر کوئی دیدار اِسے دیکھ
فطرت نے جو کھینچی ہے وہ تصویر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے

شروانیِ معصوم کی جاگیر نہ ڈھونڈو
شروانیِ مظلوم کی جاگیر نہ ڈھونڈو
شروانیِ مخدوم کی جاگیر نہ ڈھونڈو
شروانیِ مرحوم کی جاگیر نہ ڈھونڈو
شروانیِ مرحوم کی جاگیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے

گُل پوش مکاں اور گُل اندام مکیں بھی

کم یاب نہیں حُسن زمانے میں کہیں بھی
دُنیا میں بہت نقش ہیں دل کش بھی حسیں بھی
جو خامۂ قدرت کی ہے تحریر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے
جس حُسن کا عشاق سناتے ہیں فسانہ
جس حُسن کے ہر ناز پہ مِٹتا ہے زمانہ
جس حُسن کا ہے لب پہ مُغنّی کے ترانہ
جس حُسن کے جلووں کی نہ حد ہے نہ ٹھکانا
اُس حُسنِ جہاں تاب کی تنویر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے
سرمایہ و محنت کا ہے جو مسئلۂ خاص
افلاس و امارت کا ہے جو مسئلۂ خاص
دہقان کی عظمت کا ہے جو مسئلۂ خاص
مزدور کی شوکت کا ہے جو مسئلۂ خاص
اس مسئلہ خاص کی تفسیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے
اُلفت کے پیمبر ہیں پرستار اِسی کے
اخلاص کی مَے پیتے ہیں مے خوار اِسی کے
مردانِ مجاہد ہیں طلب گار اِسی کے
ہندو ہوں کہ مسلم ہیں گرفتار اِسی کے

وابستہ ہیں سب جس سے وہ زنجیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے
سرمائے کے بیٹوں کی ہوئی خوب دُکاں بند
جاگیر پرستوں پہ ہوئی راہِ اماں بند
محکومیٔ مجبور کی تھی کب سے زباں بند
صدیوں کی غلامی کے ہیں کس درجہ گراں بند
کاٹے گی جو یہ بند وہ شمشیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے

☆☆☆☆☆

مزدور

جون کی گرمی کڑکتی دھوپ لُو چلتی ہوئی
ہر گھڑی مزدور کے سر سے قضا ٹلتی ہوئی
سر پہ گارے کی کڑاہی اور دیوارِ بلند
ہانپتا وہ چڑھ رہا ہے لے کے ہمت کی کمند
پاڑ پر پہنچا تو اِک گالی سُنی معمار سے
جی میں آیا سر کو ٹکرا دے اِسی دیوار سے
ہائے اِس مظلوم کی مجبوریاں ناچاریاں
جان کا آزار ہیں افلاس کی بیماریاں
دل میں کہتا ہے کہ یہ معمار بھی مزدور ہے
پھر یہی جانِ حزیں کیوں اِس قدر مقہور ہے
اِس کی اُجرت مجھ سے دُگنی ہے مگر کم ہے شعور
تمکنت کس بات پر کس چیز پر اِتنا غرور
میں اگر نادار ہوں یہ بھی نہیں سرمایہ دار
بھوت وہ ہے کس بڑائی کا جو اِس پر ہے سوار
اینٹ گارا میں نہ دُوں اِس کو تو یہ کس کام کا
اصل میں معمار میں ہوں یہ فقط ہے نام کا
میری ہمت کہہ رہے ہیں کاخِ ایوانِ بلند
آہ! اِس پر بھی میں دُنیا میں ہوں اِتنا مستمند

لگ گیا پھر کام میں یہ سوچ کر وہ بد نصیب
اے خدا! دُنیا میں اِتنا بھی نہ ہو کوئی غریب
دِن ڈھلا جس وقت مالک بھی مکاں کا آ گیا
اِک سکوتِ مرگ سا دیوار و در پر چھا گیا
کانپتا رہتا ہے ہر مزدور جس کے نام سے
سب اِسی دُھن میں تھے وہ خوش ہو ہمارے کام سے
اُس کی پیشانی پہ لیکن بل ذرا آنے لگے
پھن اُٹھا کر تمکنت کے سانپ لہرانے لگے
سب سے پہلے اُس نے گالی دی اسی معمار کو
اپنی ملکیت جو سمجھا تھا ہر اِک دیوار کو
جوشِ نخوت سے کہا اُس نے کہ اے پاجی لعیں!
کل جہاں تک تھی گئی دیوار اب بھی ہے وہیں
کیا کیا ہے تُو نے دن بھر میں ذرا مجھ کو بتا
یوں تکبّر میں وہ آکر جائزہ لینے لگا
دل میں وہ مزدور پھر کہنے لگا اُف رے غضب!
جو بھی اِس دُنیا میں ہیں، فرعون ہیں وہ سب کے سب
جس کا جس پر بس چلے پامال کرتا ہے اُسے
خود اگر خوش حال ہے ، بدحال کرتا ہے اُسے
کیا کہوں سرمایہ داروں کے ستم کی داستان
دیدۂ مزدور ہے مزدور سے بھی خوں فشاں
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس ، اِس مثل کو صادق سمجھ
یہ سمجھ کر اُس خدائے پاک کو رازق سمجھ

☆☆☆☆☆

فہمیدہ ریاض

پیدائش: 28۔جولائی،1946ء ...... میرٹھ،اُتر پردیش،انڈیا

وفات: 21۔نومبر، 2018ء .... لاہور،پاکستان

ترقی پسند شاعرہ ، ادیبہ اور حقوقِ نسواں کی علم بردار فہمیدہ ریاض نے اپنی تصانیف 'گوداوری'، 'خطِ مرموز' اور اپنی کچھ نظموں کی بدولت بے پناہ شہرت حاصل کی ۔ اُنھوں نے 'خانۂ آب و گل' کے نام سے مثنوی مولانا روم کا اُردو ترجمہ کیا۔علاوہ ازیں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور شیخ ایاز کی کُتب کا بھی اُردو ترجمہ کیا۔ وہ جنرل ضیاء الحق کی مارشل لائی گھٹن سے تنگ آ کر ترکِ وطن کر کے بھارت چلی گئیں اور کم وبیش سات برس کا عرصہ وہاں گزار دیا۔اُن کا شعری مجموعہ 'اپنا جُرم ثابت ہے' اسی گھٹن زدہ ماحول کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔

17 خوب صورت کُتب کی خالق فہمیدہ ریاض کی پوری زندگی تنازعات میں گِھری رہی ۔اُنھوں نے فیمینزم کو Redefine کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ایک حلقہ میں اُنھیں ناپسندیدگی کا سامنا کرنا پڑا لیکن اُردو ادب کے قارئین کے ایک بڑے حلقے کی اُنھیں ہم نوائی بھی نصیب ہوئی۔

فہمیدہ نے جو کہنا چاہا، کُھل کر کہا اور اُسے غلط یا صحیح قرار دینے کا اختیار نام نہاد ادبی جوگادریوں کو نہیں دیا، بل کہ قارئین سے ہی فیصلے کی توقع رکھی اور اسے ہی درست جانا۔

باکرہ

آسماں تپتے ہوئے لوہے کی مانند سفید
ریگ سُوکھی ہوئی پیاسے کی زباں کے مانند
پیاس حلقوم میں ہے، جسم میں ہے، جان میں ہے

سر بہ زانو ہوں، جُھلستے ہوئے ریگستاں میں
تیری سرکار میں لے آئی ہوں یہ وحشِ ذبیح!
مجھ پہ لازم تھی جو قربانی وہ میں نے کردی

اُس کی اُبلی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک ہے چمک
اور سیہ بال ہیں بھیگے ہوئے خوں سے اب تک
تیرا فرمان یہ تھا اس پہ کوئی داغ نہ ہو
سو یہ بے عیب اچھوتا بھی تھا، ان دیکھا بھی
بے کراں ریگ میں سب گرم لہو جذب ہوا
دیکھ چادر پہ مری ثبت ہے اس کا دھبّا
اے خداوندِ کبیر............ اے جبار! متکبر جلیل!
ہاں ترے نام پڑھے اور کیا ذبح اسے
اب کوئی پارۂ ابر آئے، کہیں سایہ ہو
اے خداوندِ عظیم!
بادِ تسکیں! کہ نفس آگ بنا جاتا ہے
قطرۂ آب کہ جاں لب پہ چلی آئی ہے

☆☆☆☆☆

بدن دریدہ

سرسرانے دو ذرا رات کے اِس ریشم کو
اِس میں ملفوف کسی عہد کی اِک لاش بھی ہے
رات جو جرم بھی ہے ، جرم کی پاداش بھی ہے
رات پانی کی طرح سر سے مِرے بہتی ہے
مِرے بالوں سے ٹپکتی ہوئی بوندیں جیسے
مِرے شانوں سے ڈھلکتی ہوئی گرتی جائیں
بند ہونے لگیں آنکھیں ، وہ نشہ طاری ہے
ہاں ذہن میں ہے مِرے ذائقہ اُن بوسوں کا
جن کو چکھنے سے بھی انکار کیا تھا دل نے
میری رگ رگ میں وہ سیّال رواں ہے اب تک
جس سے بچ جانے پہ اصرار کیا تھا دل نے
مِرے اطراف پتنگوں کی طرح اُڑتے ہیں
مِرے بوسے ، وہ مِرے جھوٹ سے بوجھل بوسے
خون کی چھینٹیں اُڑاتے ہوئے گھائل بوسے
کب کی وہ کش مکشِ ذہن و زباں ختم ہوئی
اِک تڑپ باقی تھی سو دُشمنِ جاں ختم ہوئی
اب تو وہ میری تھکاوٹ بھی مجھے چھوڑ چکی

اِک سیہ لہر بہائے لیے جاتی ہے مجھے
خوں روانی سے بدن چھوڑ رہا ہو جیسے
نیند ہے ، موت ہے یا یہ کوئی بے ہوشی ہے
اب تو ہر سانس دمِ باز پسیں لگتی ہے

☆☆☆☆☆

فیض احمد فیض

پیدائش: 13۔فروری، 1911ء ...... نارووال، پاکستان

وفات: 20۔نومبر، 1984ء .... لاہور، پاکستان

شاعر، مدیر، ٹریڈ یونینسٹ ، معلّم اور لینن امن انعام یافتہ، لوٹس انعام برائے ادب جیتنے والے لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیض ایک نام ور شخصیت خان بہادر سلطان محمد خاں، بیرسٹر، سابق میر منشی امیر عبدالرحمٰن خاں والیِ افغانستان کے صاحب زادے تھے۔ اقبال کی طرح مرے کالج سیالکوٹ اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی ۔ایم اے او کالج امرتسر اور ہیلی کالج لاہور میں انگریزی کے اُستاد رہے۔ڈیلی 'پاکستان ٹائمز' اور 'اِمروز' کے ایڈیٹر رہے اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے صدر رہے۔

فیض احمد فیض استعماری نظامِ معیشت کے حامی تھے۔اُنھوں نے رومان اور مزاحمت کو اِس خوب صورتی سے ملا جلا دیا کہ وہ ہر طرح کے قاری کے پسندیدہ شاعر بن گئے۔اُنھوں نے خود تو اُردو اور پنجابی میں لکھا لیکن اُن کی شاعری کے تراجم ہندی، رشین، انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔فیض احمد فیض اُردو زبان میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعر ہیں ۔اُردو نظم کوئی دوسرا فیض احمد فیض پیش کرنے سے قاصر ہے، گرچہ اُنھوں نے بہت خوب صورت غزل بھی کہی۔ایک غزل کے دو اشعار دیکھیئے :

☆ ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

☆ اِک فرصتِ گناہ ملی ، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردِگار کے

موضوعِ سُخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سُلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور اُن ہاتھوں سے مَس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات

اُن کا آنچل ہے کہ رخسار ، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حُسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں ، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حِنا کی تحریر

اپنے افکار کی ، اشعار کی دُنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی ، شاہدِ معنٰی ہے یہی

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟

موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی ، اجداد پہ کیا گزری ہے؟
اِن دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت ، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا!
کس لیے اِن میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے؟

یہ ہر اِک سمت پراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اِک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں ، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اُس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اُس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سُخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن اِن کے سوا اور نہیں

☆☆☆☆☆

دُعا

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسمِ دُعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بُت ، کوئی خدا یاد نہیں

آیئے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ اِمروز میں شیرینیٔ فردا بھر دے
وہ جنھیں تابِ گراں باریٔ ایّام نہیں
اُن کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رُخِ صبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
اُن کی نظروں پہ کوئی راہ اُجاگر کر دے

جن کا دیں پیرویٔ کِذب و ریا ہے اُن کو
ہمّتِ کُفر ملے ، جُرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر مُنتظرِ تیغِ جفا ہیں اُن کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق مِلے

عشق کا سِرِّ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مِٹ جائے

☆☆☆☆☆

نثار میں تیری گلیوں کے

نثار میں تِری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے ، جِسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقیّد ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس ، مُدّعی بھی ، مُنصف بھی
کسے وکیل کریں ، کس سے مُنصفی چاہیں

مگر گزارنے والوں کے دِن گزرتے ہیں
تِرے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بُجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے ، نہ اپنی رِیت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے ، نہ اُن کی جیت نئی

اِسی سبب سے فلک کا گِلہ نہیں کرتے
ترے فِراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جُدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا اُستوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

☆☆☆☆☆

مجھ سے پہلی سی محبت مِری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مِری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا کہ تُو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سِوا دُنیا میں رکھا کیا ہے؟
تُو جو مل جائے تو تقدیر نِگوں ہو جائے
یُوں نہ تھا ، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بِکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے ، خون میں نہلائے ہوئے

لَوٹ جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے تِرا حُسن ، مگر کیا کیجئے

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مِری محبوب نہ مانگ

☆☆☆☆☆

قتیل شفائی

پیدائش 24۔دسمبر، 1919ء .... ہزارہ، پاکستان

وفات: 11۔جولائی، 2001ء ...... لاہور، پاکستان

افسانہ نگار اور شاعر اورنگ زیب خان قتیل شفائی کے والد فیروز خان ہندکو کے شاعر تھے اور امیر کبیر آدمی تھے، اِس کے باوجود قتیل تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ اُنھوں نے کچھ دیر راولپنڈی میں ایک ٹرانسپورٹر کے ہاں ملازمت کی لیکن 1946ء میں وہ لاہور چلے آئے اور 'ادبِ لطیف' میں کام کرنے لگے۔ اُسی عہد میں اُنھوں نے پہلی بار فلم 'تیری یاد' کے گیت لکھے۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور یوں اُنھوں نے کم وبیش 2500 فلمی گیت لکھے۔ فلمی نغمہ نگاری کی اِس کثیر تعداد کی وجہ سے اُنھیں پاکستان کا ساحر لدھیانوی کہا جانے لگا۔ فلم 'شیریں فرہاد'، 'نائلہ'، 'انتظار'، 'گمنام'، 'یہ ہے ممبئی میری جان' اور پھر 'تیری کہانی یاد آئی' میں تو اُن کا فن بلندیوں کو چھو رہا ہے۔

قتیل شفائی کے عہد میں اختر شیرانی کی رومانوی نظموں کا بول بالا تھا اور اس کی 'سلمیٰ' مرکزِ توجہ بن چکی تھی۔ رومانیت کی یہ کیفیت تو قتیل پر حاوی تھی ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے جوش، فراق اور ن۔م راشد کا اثر بھی قبول کیا۔ اُن کے 14 شعری مجموعے شائع ہو کر زبردست پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔

آیئے کچھ کلام پڑھتے ہیں:

نائکہ

دیکھ بیٹا یہ ترے ہی فائدے کی بات ہے

دیکھ جھٹلایا نہیں کرتے بڑے بوڑھوں کی بات
تُو نہ مانے گی تو اِس بازی میں کھا جائے گی مات
واری جاؤں یہ جہاں جو کچھ بھی کہتا ہے ، کہے
تجھ میں کوئی عیب ہے جو ایک کی ہو کر رہے؟
اِس طرح محدود ہو جانے سے تُو انکار کر
جو بھی اپنی جیب کھنکائے اُسی سے پیار کر
پیار کر اُس سے جو تیری چاہ میں غرقاب ہو
چاہے وہ کنجڑا ہو ، نیلاری ہو یا قصاب ہو
تیری پڑنانی ، خدا بخشے ، بڑی ہُشیار تھیں
ایک دو کیا وہ تو سارے شہر کی دلدار تھیں
پھر بھی لیکن آرزوئے راہِ آزادی نہ کی
اُن بہشتن نے تو مرتے دم تلک شادی نہ کی
تیرے دل میں ہے اگر کچھ اپنے بچوں کا خیال
اپنے پیشے کو وفاداری کے جھنجھٹ میں نہ ڈال

دیکھ بیٹا یہ ترے ہی فائدے کی بات ہے

☆☆☆☆☆

نظم

میرے محبوب وطن ، حکم ملا ہے ہم کو
شہر میں کوئی ترا چاہنے والا نہ رہے

اپنے سر جس نے ترے پیار کی تہمت لی ہے
مل کے سب نے اُسے رسوا سرِ بازار کیا

پتھروں سے ، کبھی طعنوں سے نوازا اُس کو
اور پھر شہر بدر کر کے یہ اصرار کیا

اُس کی شمعیں بجھا دو کہ اُجالا نہ رہے
میرے محبوب وطنِ حکم ملا ہے ہم کو

چکھ لیا جس نے کبھی تیری محبت کا مزا
تلخیِ غم کو وہی مات دیا کرتا ہے

ایک ایسا بھی تو پیالہ ہے کہ سچ کی خاطر
مسکرا کر جسے سقراط پیا کرتا ہے

شاید اب دہر میں وہ زہر کا پیالہ نہ رہے
میرے محبوب وطن ، حکم ملا ہے ہم کو

یہ صدی ہو کہ زمانہ ہو پُرانا تیرا
ہر کوئی ہم کو ترے پیار کا حق دیتا ہے

لیکن اے پیارے وطن ہاتھ یہ کس کا ہے بتا
جو ہمیں اب بھی غلامی کا سبق دیتا ہے

کاش اس ہاتھ میں سونے کا نوالہ نہ رہے
میرے محبوب وطن ، حکم ملا ہے ہم کو

جانے یہ حکم ملا شہر کے کس گوشے سے
دل کی باتیں نہ کرو سیکھ لو دُنیا داری

جن سے ملتا ہو سبق تیری وفا داری کا
پھاڑ کر پھینک بھی دو تم وہ کتابیں ساری

تا کہ باقی کوئی اُلفت کا حوالہ نہ رہے
میرے محبوب وطن حکم ملا ہے ہم کو

عشق کی راہ میں رکھتا ہے قدم جب کوئی
مشورہ دینے کو لوگ آتے ہیں کیسے کیسے

کوئی کہتا ہے کہ منزل پہ پہنچنا ایسے
پاؤں کٹ جائیں مگر پاؤں کا چھالا نہ رہے

میرے محبوب وطن ، حکم ملا ہے ہم کو
دل ہے وہ شمع کہ جلتی ہے تو بجھتی ہی نہیں

اہلِ دل رکھتے ہیں روشن اسے طوفانوں میں
روشنی مانگتے ہیں چاند ستارے اس سے

جھلملاتا ہے یہ صحراؤں بیابانوں میں
دل ہی بجھ جائے تو دُنیا میں اُجالا نہ رہے

میرے محبوب وطن ، حکم ملا ہے ہم کو

☆☆☆☆☆

کفیل آذر امروہوی

پیدائش: 23۔اپریل،1940ء ...... امروہہ،اُتر پردیش،انڈیا

وفات: 28۔نومبر،1993ء ...... امروہہ،اُتر پردیش،انڈیا

فلمی نغمہ نگار کفیل آذر امروہوی کی ہندوستانی فلمی صنعت میں اُس وقت پہچان بنی جب اُن کا یہ گیت ہندوستان کے کے بچے بچے کی زبان سے سُنا گیا:

چھیلا بابو تُو کیسا دلدار نکلا   چور سمجھی تھی میں، تھانیدار نکلا

اُنھوں نے گیت کے علاوہ غزل اور نظم میں بھی طبع آزمائی کی اور یوں ایک مجموعہ 'دھوپ کا دریچہ' ترتیب پا گیا۔ البتہ ان کی اصل پہچان ایک نظم بنی جو' چھیلا بابو.................' سے

بھی زیادہ مقبول ہوئی۔ یہ نظم دُنیا بھر میں نہ صرف اُردو ادب کے قارئین سے سندِ امتیاز حاصل کر چکی ہے بلکہ اُردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے عوام الناس کے ذہن وقلب کو بھی معطّر کیے رکھتی ہے۔ آیئے پڑھتے ہیں:

نہ جانے کیا ہو؟

بات نکلے گی تو پھر دُور تلک جائے گی
لوگ بے وجہ اُداسی کا سبب پوچھیں گے
یہ بھی پوچھیں گے کہ تم اِتنی پریشاں کیوں ہو؟
جگمگاتے ہوئے لمحوں سے گریزاں کیوں ہو؟
اُنگلیاں اُٹھیں گی سُوکھے ہوئے بالوں کی طرف
اِک نظر دیکھیں گے گزرے ہوئے سالوں کی طرف
چوڑیوں پر بھی کئی طنز کیے جائیں گے
کانپتے ہاتھوں پہ فقرے بھی کسے جائیں گے
لوگ ظالم ہیں ہر اِک بات کا طعنہ دیں گے
باتوں باتوں میں مِرا ذکر بھی لے آئیں گے
اُن کی باتوں کا ذرا سا بھی اثر مت لینا
ورنہ چہرے کے تأثر سے سمجھ جائیں گے
چاہے کچھ بھی ہو سوالات نہ کرنا اُن سے
مِرے بارے میں کوئی بات نہ کرنا اُن سے
بات نکلے گی تو پھر دُور تلک جائے گی

☆☆☆☆☆

کمار پاشی

پیدائش: 3۔جولائی،1935ء ...... بہاولپور، پاکستان

وفات:17۔ستمبر،1992ء ...... دِلّی،انڈیا

شاعر اور افسانہ نگار شنکر دت کمار، کمار پاشی کا خاندان 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد دِلّی سے بہاولپور ہجرت کر گیا لیکن تقسیمِ ہند کے وقت دوبارہ دِلّی میں سکونت اختیار کر لی۔شنکر کمار پاشی انتہائی سنجیدہ طبیعت کے کم گو انسان تھے۔اُنھیں ہندوستانی اساطیر کا شاعر کہا جاتا ہے۔اُنھوں نے کامیاب افسانے اور ڈرامے بھی تخلیق کیے اور دِلّی میں ادبی پرچے 'سطور' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

کمار پاشی کے آٹھ شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں 'چاند چراغ' بعد از مرگ ہے جو 1994ء میں شائع ہوا۔اُن کا افسانوی مجموعہ 'پہلے آسماں کا زوال' 1972ء میں اور ڈرامے 'جملوں کی بنیاد' 1974ء میں شائع ہوئے۔

کمار پاشی نے بہت اعلیٰ درجے کی نظمیں لکھیں جن میں 'خواہش کا جرم'، 'سوگندھی' اور 'شریف زادوں کے لیے' بہت مقبول ہوئیں۔

شریف زادوں کے لیے

مجھے یاد ہے اب سے کچھ دیر پہلے
کوئی کہہ رہا تھا
وہ لڑکی کئی سال سے
اپنے بستر پہ تنہا نہیں سو سکی ہے
سُنا ہے کئی سال پہلے
وہ ماں سے بچھڑ کر
کہیں دُور کے ریگ زاروں میں گم ہو گئی تھی
لباس اس کا اب
میرے گاؤن میں اُلجھا ہوا ہے
میرے بستر کے بالکل قریب
اِک تپائی پہ رکھا ہوا ہے
وہ کیچڑ میں لت پت ہمیشہ کی مانند
ہر لمحہ بڑھتے ہوئے
بوجھ کو ڈھو رہی ہے
کسی بے زباں جانور کی طرح
سال ہا سال سے
یونہی چُپ چاپ سی
اپنے ہی جسم کے

گوشت کو اوڑھ کر

سو رہی ہے

یونہی............سال ہا سال سے

[2]

اُس نے پچھلے کسی جنم میں

ناگ راج کا سر کچلا تھا

جنم جنم سے

وہ خود سے

چھپتا پھرتا ہے

اپنے ہی مُردار بدن میں

اب کونا ڈھونڈ رہا ہے

جس کے باہر اس کے لہو کی

گندھ نہ جائے

ناگن اس کو ڈھونڈ نہ پائے

سچ کہتا ہوں

جنم جنم سے

میں خود سے چھپتا پھرتا ہوں

☆☆☆☆☆

کیفی اعظمی

پیدائش:15۔اگست،1918ء ...... اعظم گڑھ،یو۔پی،انڈیا

وفات: 10۔مئی،2002ء ...... ممبئی،انڈیا

اطہر حسین رضوی، کیفی اعظمی بعض سوانح نگاروں کے مطابق 14۔ جنوری،1919ء کو پیدا ہوئے۔اُنھوں نے بہت چھوٹی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔اُردو ادب کو سینما تک لانے میں اُن کا کردار نا قابلِ فراموش ہے۔اُنھوں نے بہترین کہانی پر فلم فیئر ایوارڈ، ازاں بعد ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور پدم شری اعزاز برائے ادب و تعلیم حاصل کیا۔کیفی اعظمی سرتاپا فن کار تھے۔اُن پر جامعاتی تحقیق بھی ہوئی جس میں 'کیفی اعظمی ....فکر و فن' ڈاکٹر شکیلہ رفعت، گورکھ پور یونیورسٹی اور 'کیفی اعظمی ....شخصیت، شاعری اور عہد' ڈاکٹر وسیم انور، ساگر یونیورسٹی قابلِ ذکر ہے۔

بابری مسجد کی شہادت پر اُن کا یہ کلام ہندوستانی مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا۔

رام بن باس سے جب لوٹ کے گھر میں آئے
یاد جنگل بہت آیا جو نگر میں آئے

اُن کی غزلیں:

'تم اِتنا جو مسکرا رہے ہو کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو' اور
آج سوچا تو آنسو بھر آئے مُدّتیں ہو گئیں مسکرائے

زبان زدِ عام ہیں۔اُن کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'جھنکار' 1943ء میں شائع ہوا۔ازاں بعد 'آخرِ شب'، 'سرمایہ' اور 'کیفیت' اشاعت پذیر ہوئے۔آیئے اُن کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں:

میرا ماضی میرے کاندھے پر

اب تمدن کی ہو یہ جیت کہ ہار
میرا ماضی ہے ابھی تک مِرے کاندھے پہ سوار
آج بھی دَور کے گلّے میں جو مل جاتا ہوں
جاگ اُٹھتا ہے مِرے سینے میں جنگل کوئی
سینگ ماتھے پہ اُبھر آتے ہیں
پڑتا رہتا ہے مِرے ماضی کا سایہ مجھ پر
دَورِ خوں خواری سے گزرا ہوں چھپاؤں کیوں کر
دانت سب خون میں ڈوبے ہوئے آتے ہیں نظر
جن سے میرا نہ کوئی بَیر نہ پیار
ان پہ کرتا ہوں میں وار
ان کا کرتا ہوں شکار
اور بھرتا ہوں جہنم اپنا
پیٹ ہی پیٹ مِرا جسم ہے دل ہے نہ دماغ
کتنے اوتار بڑھے لے کے ہتھیلی پہ چراغ
دیکھتے رہ گئے دھو پائے نہ ماضی کے یہ داغ

مل لیا ماتھے پہ تہذیب کا غازہ لیکن

بربریت کا ہے جو داغ وہ چھوٹا ہی نہیں

گاؤں آباد کیے شہر بسائے ہم نے

رشتہ جنگل سے جو اپنا ہے وہ ٹوٹا ہی نہیں

جب کسی موڑ پہ پرکھول کے اُڑتا ہے غبار

اور نظر آتا ہے اس میں کوئی معصوم شکار

جانے ہو جاتا ہے کیوں سر پہ جنوں ایک سوار

کسی جھاڑی سے اُلجھ کر جو کبھی ٹوٹی تھی

وہی دُم پھر سے نکل آتی ہے

وہی لہراتی ہے

اپنی ٹانگوں میں دبا کر جسے بھرتا ہوں زقند

اتنا گر جاتا ہوں صدیوں میں ہوا جتنا بلند

☆☆☆☆☆

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
راکھ کے ڈھیر میں ، شعلہ ہے نہ چنگاری ہے
اب نہ وہ پیار نہ اُس پیار کی یادیں باقی
آگ یوں دل میں لگی کچھ نہ رہا ، کچھ نہ بچا
جس کی تصویر نگاہوں میں لیے بیٹھی ہو
میں وہ دلدار نہیں اُس کی ہوں خاموش چِتا
زندگی ہنس کے گزرتی تو بہت اچھا تھا
خیر ہنس کر نہ سہی ، رو کے گزر جائے گی
راکھ برباد محبت کی بچا رکھی ہے
بار بار اس کو جو چھیڑا تو بکھر جائے گی
جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
آرزو جرم ، وفا جرم ، تمنا ہے گناہ
یہ وہ دُنیا ہے جہاں پیار نہیں ہو سکتا
کیسے بازار کا دستور تمھیں سمجھاؤں
بِک گیا جو وہ خریدار نہیں ہو سکتا

☆☆☆☆☆

عورت

اُٹھ مِری جان مِرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
قلب ماحول میں لرزاں شررِ جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولۂ سنگ ہیں آج
حُسن اور عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج
جس میں جلتا ہوں اُسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اُٹھ مِری جان مِرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تیرے قدموں میں ہے فردوسِ تمدن کی بہار
تیری نظروں پہ ہے تہذیب و ترقی کا مدار
تیری آغوش ہے گہوارۂ نفس و کردار
تابہ کے گرد ترے وہم و تعیّن کا حصار
کوند کر مجلسِ خلوت سے نکلنا ہے تجھے
اُٹھ مِری جان مِرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تُو کہ بے جان کھلونوں سے بہل جاتی ہے
تپتی سانسوں کی حرارت سے پگھل جاتی ہے
پاؤں جس راہ میں رکھتی ہے پھسل جاتی ہے
بن کے سیماب ہر اِک ظرف میں ڈھل جاتی ہے
زیست کے آہنی سانچے میں بھی ڈھلنا ہے تجھے

اُٹھ مِری جان! مِرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

زندگی جہد میں ہے ، صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خمِ گیسو میں نہیں
جنت اِک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روِش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اُٹھ مِری جان مِرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

گوشہ گوشہ میں سُلگتی ہے چِتا تیرے لیے
فرض کا بھیس بدلتی ہے قضا تیرے لیے
قہر ہے تیری ہر اِک نرم ادا تیرے لیے
زہر ہی زہر ہے دُنیا کی ہوا تیرے لیے
رُت بدل ڈال اگر پھولنا پھلنا ہے تجھے
اُٹھ مِری جانِ مِرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قدر اب تک تِری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تُو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اِک چیز ، جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے

اُٹھ مِری جان مِرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
توڑ کر رسم کا بُت بندِ قدامت سے نکل
ضُعفِ عشرت سے نکل ، وہمِ نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل
قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل
راہ کا خار ہی کیا ، گُل بھی کُچلنا ہے تجھے
اُٹھ مِری جان مِرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ یہ عزم شکن دغدغۂ پند بھی توڑ
تیری خاطر ہے جو زنجیر وہ سوگند بھی توڑ
طوق یہ بھی ہے زمرد کا گلو بند بھی توڑ
توڑ ، پیمانۂ مردانِ خرد مند بھی توڑ
بن کے طوفان چھلکنا ہے ، اُبلنا ہے تجھے
اُٹھ مِری جان مِرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تُو فلاطون و ارسطو ہے ، تُو زہرہ پرویں
تیرے قبضہ میں ہے گردُوں ، تِری ٹھوکر میں زمیں
ہاں اُٹھا ، جلد اُٹھا پائے مقدر سے جبیں
میں بھی رُکنے کا نہیں ، وقت بھی رُکنے کا نہیں
لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے
اُٹھ مِری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

☆☆☆☆☆

گلزار

پیدائش:18۔اگست،1936ء ...... دینہ،جہلم،پاکستان
بھارت میں مقیم ادب اور فن کی خدمت میں مصروف ہیں۔

شاعر،نغمہ نگار، افسانہ نگار،فلم ساز اور ہدایت کار سمپورن سنگھ کالرا،گلزار دینوی (اور اب گلزار) جیو پولیٹکل باؤنڈریز سے آزاد،سرحد کے دونوں اطراف ایک ہی درجہ مقبولیت پر نظر آتا ہے۔اپنے نام کی طرح خوب صورت کالرا قارئین کو اِس لیے بھی پسند ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کے لیے پاک و ہند کے اندر بولی جانے والی ہرزبان کو اپنی ہی سمجھتا ہے۔

سمپورن حصولِ تعلیم کے لیے کچھ دیر دینہ کے ایک سکول میں گیا لیکن والد مکھن سنگھ اُس کی پڑھائی کو سُودوزیاں کے ترازو میں تولنے لگا۔یوں سمپورن کو ایک موٹر مکینک کی شاگردی میں دے دیا۔تقسیم کے وقت مکھن سنگھ جوہرِ قابل سمپورن کو لیے بھارت چلا گیا۔1963ء میں اچانک اس کے ایک فلمی گیت نے ہندوستان بھر میں اُس کی بحثیت نغمہ نگار پہچان بنادی۔یہ پہچان پہلے گلزار دینوی کے نام سے بنی اور ازاں بعد وہ صرف گلزار کے نام سے جانا جانے لگا۔

گلزار نے بہت لکھا لیکن اُس کے شعری مجموعے جو شعر کے قارئین میں نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں وہ 'چاند پکھراج کا' اور 'رات پشمینے کی' ہیں۔اُس نے بے شمار ایوارڈ حاصل کیے جن میں گریمی ایوارڈ، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور پدما بھوشن ایوارڈز شامل ہیں۔گلزار کی سوانح حیات اُس کی بیٹی میگھنا گلزار نے لکھی جو 'Because He is' کے نام سے شائع ہوئی۔

اور اب گلزار کی کچھ نظمیں:

لَمس

قرآن ہاتھوں میں لے کے نابینا اِک نمازی
لبوں پہ رکھتا تھا دونوں آنکھوں سے چومتا تھا
جھکا کے پیشانی، یوں عقیدت سے چھو رہا تھا
جو آیتیں پڑھ نہیں سکا، اُن کا لمس محسوس کر رہا ہو
میں حیراں حیراں گزر رہا تھا
میں حیراں حیراں ٹھہر گیا ہوں
تمھارے ہاتھوں کو چوم کر،
چھو کے اپنی آنکھوں سے آج میں نے
جو آیتیں پڑھ نہیں سکا، اُن کے لمس محسوس کر لیے ہیں

☆☆☆☆☆

اعتراف

مجھ کو بھی ترکیب سکھا کوئی یار جُلا ہے

اکثر تجھ کو دیکھا ہے کہ تانا بُنتے

جب کوئی تا گا ٹوٹ گیا یا ختم ہوا

پھر سے باندھ کے

اور سِرا کوئی جوڑ کے اُس میں

آگے بُننے لگتے ہو

تیرے اِس تانے میں لیکن

اِک بھی گانٹھ ،گرہ بنتر کی

دیکھ نہیں سکتا ہے کوئی

میں نے تو اِک بار بُنا تھا ایک ہی رشتہ

لیکن اُس کی ساری ِگرہیں

صاف نظر آتی ہیں میرے یار جُلا ہے!

☆☆☆☆☆

کتابیں

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں،
اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہو گئی ہے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
جو قدریں وہ سناتی تھیں ....
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں
وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں
کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اِک سِسکی نکلتی ہے
کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بِنا پتّوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ
جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے

جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں

بہت سی اصطلاحیں ہیں........................

گلاسوں نے انھیں متروک کرڈالا

زباں پہ ذائقہ آتا تھا جو صفحے پلٹنے کا

اب اُنگلی کلِک کرنے سے بس اک جھپکی گزرتی ہے

بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھُلتا چلا جاتا ہے پردے پر

کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا، کٹ گیا ہے

کبھی سینے پہ رکھ کر لیٹ جاتے تھے، کبھی گودی میں لیتے تھے

کبھی گھٹنوں کو اپنے رحل کی صورت بنا کر

نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے، چھوتے تھے جبیں سے

وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی

مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول اور

مہکے ہوئے رقعے

کتابیں مانگنے، گرنے، اُٹھانے کے بہانے رشتے بنتے تھے

اُن کا کیا ہوگا؟

وہ شاید اب نہیں ہوں گے

☆☆☆☆☆

مجاز لکھنوی

پیدائش: 19۔اکتوبر، 1911ء ...... بارہ بنکی، انڈیا

وفات: 5۔دسمبر، 1955ء ...... لکھنؤ، انڈیا

اسرار الحق، مجاز لکھنوی ابتدائی زندگی میں ہی لکھنؤ آ گئے اور وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تاہم بی اے 1935ء میں علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی سے کیا۔لکھنؤ آ کر 'نیا ادب' اور 'پرچم' کی ادارت کی۔مجاز نے بہت مختصر زندگی پائی لیکن بہت خوب صورت نظمیں تخلیق کیں۔اُن کی نظم 'آوارہ' 1953ء میں طلعت محمود کی آواز میں فلم 'ٹھوکر' میں شامل ہوئی تو اُن کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

مجاز کو شاعرِ انقلاب کہا گیا لیکن اُنھوں نے انقلاب اور رباب دونوں کا دامن تھامے رکھا۔اُنھوں نے ساٹھ کے لگ بھگ انتہائی دل گداز نظمیں لکھیں جن میں 'آوارہ'، 'اعتراف'، 'کس سے محبت ہے'، 'ایک غمگین یاد'، 'انقلاب' اور اندھیری رات کا مسافر' بہت مقبول ہوئیں۔اُن کی غزل بھی بہت پسند کی گئی اور مشاعروں میں سامعین نے کھل کر داد دی۔چند اشعار دیکھیے:

☆ کبھی ساحل پہ رہ کر شوق ، طوفانوں سے ٹکرائیں
کبھی طوفاں میں رہ کر فکر ہے ، ساحل نہیں ملتا

☆ یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس رسماً چلے آئے
یہ ملنا خاک ملنا ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا

اُن کی شاعری کے تین مجموعے 'شب تاب'، 'آہنگ' اور 'سازِ نو' شائع ہوئے۔جواں مرگ مجاز کا ایک ناقابلِ فراموش کام علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کے ترانے کی تخلیق ہے۔

اِس مجموعے میں شامل ہیں: 'کس سے محبت ہے' اور 'ایک غمگین یاد'

ایک غمگین یاد

مِرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فرازِ آسماں پر کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اُٹھتی تھی اُس کی چشمِ خنداں میں
خُمستانِ فلک سے نور کی صہبا چھلکتی تھی

مِرے بازو پہ جب وہ زُلفِ شب گوں کھول دیتی تھی
زمانہ نکہتِ خُلدِ بریں میں ڈوب جاتا تھا
مِرے شانے پہ جب سر رکھ کے ٹھنڈی سانس لیتی تھی
مِری دُنیا میں سوز و ساز کا طوفان آتا تھا

وہ میرا شعر جب میری ہی لَے میں گُنگُناتی تھی
مناظر جھومتے تھے ، بام و در کو وجد آتا تھا
مِری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب مسکراتی تھی
مِرے ظُلمت کدے کا ذرّہ ذرّہ مُسکراتا تھا

اُمڈ آتے تھے جب اشکِ محبت اُس کی پلکوں تک
ٹپکتی تھی در و دیوار سے شوخی تبسّم کی
جب اُس کے ہونٹ آ جاتے تھے از خود میرے ہونٹوں تک
جھپک جاتی تھیں آنکھیں آسماں پر ماہ و انجم کی

وہ جب ہنگامِ رُخصت دیکھتی تھی مجھ کو مُڑ مُڑ کر
تو خود فطرت کے دل میں محشرِ جذبات ہوتا تھا
وہ محوِ خواب جب ہوتی تھی اپنے نرم بستر پر
تو اُس کے سر پہ مریم کا مقدس ہاتھ ہوتا تھا

☆☆☆☆☆

کِس سے محبت ہے

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دُنیا میں رہتا ہوں وہ اس دُنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بُو ہے ، پیکرِ حُسنِ لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اُس کی

وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثُریّا بخت ہے ، زُہرہ جبیں ہے ، ماہِ طلعت ہے
مِرا ایماں ہے ، میری زندگی ہے ، میری جنت ہے
مِری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اُس کی

وہ اِک مِضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے ، جلا سکتی ہے ساری بزمِ اِمکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر سامانیاں اُس کی

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اِس دُنیا سے اکثر اس قدر آگے
مِرے تخئیل کے بازو بھی اُس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اُس کی

جبیں پر سایہ گستر ، پرتوِ قندیلِ رہبانی
عارضِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی
قدم پر لَوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سُلیمانی
ازل سے مُعتقد ہے محفلِ نُورانیاں اُس کی

ادائیں لے کے آئی ہے وہ فطرت کے خزانوں سے
جگا سکتی ہے محفل کو نظر کے تازیانوں سے
وہ ملکہ ہے ، خراج اُس نے لیے ہیں بوستانوں سے
بس اِک میں نے ہی اکثر کی ہیں نافرمانیاں اُس کی

وہ میری جُراُتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہَوَس کی ظلمتوں پر ناز کی بجلی گِرا دینا
نگاہِ شوق کی بے باکیوں پر مُسکرا دینا
جنوں کو درسِ تمکیں دے گئیں نادانیاں اُس کی

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے ، مجھ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
مِرا ہر شعر تنہائی میں اُس نے گُنگُنایا ہے
سُنی ہیں میں نے اکثر چُھپ کے نغمہ خوانیاں اُس کی

مِرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے ، میرے اندیشے مٹائے ہیں
مِرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے ، گیت گائے ہیں
مِری دُنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اُس کی

لبِ لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رُخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اُس کا ، تبسّم اُس کا گہنا ہے
نہیں آلُودہٗ ظلمت سحر دامانیاں اُس کی

کوئی میرے سوا اُس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مِرے اشعار میں جولانیاں اُس کی

☆☆☆☆☆

مجید امجد

پیدائش: 29۔جون،1914ء .... جھنگ، پاکستان

وفات: 11۔مئی،1974ء .... ساہیوال، پاکستان

عبدالمجید، مجید امجد نے ایف اے تک جھنگ میں تعلیم حاصل کی اور بی اے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے کیا ۔ جھنگ میں ہفت روزہ 'عروج' کے ایڈیٹر رہے۔ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ میں ہیڈ کلرک کی حیثیت سے کام کیا اور پھر محکمہ خوراک میں اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

مجید امجد نہایت شریف النفس، کم گو اور کمزور صحت کے آدمی تھے، لیکن اُن کی شاعری بہت خوب صورت اور بہت متأثر کُن ہے۔شاعری میں جتنا تنوع اُن کے ہاں پایا جاتا ہے وہ شاید ہی اُردو کے کسی دوسرے جدید شاعر کے حصّے میں آیا ہو۔اُن کی تقریباً ہر نظم مختلف موضوع اور مختلف ہیئت میں تخلیق ہوئی ہے اور یہ نظمیں قاری کو متحیّر کر دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔

بیاہی ہوئی سہیلی کا خط

کیا یہ سچ ہے مِری سہیلی کہ تم — جلد ہی اب بیاہی جاؤ گی
اِک نئی زندگی میں اُترو گی — اِک نئی قید گہ بساؤ گی
آج تک جن سے تم بچھڑ نہ سکیں — اُن کو اِس طرح چھوڑ جاؤ گی
ایک گھونگھٹ کی اوٹ میں چُھپ کر — زیست کی قید کاٹ جاؤ گی
نقرئی بندھنوں میں جکڑی ہوئی — راہِ ہستی پہ ڈگمگاؤ گی
پھر بھی آئیں گی چاندنی راتیں — تم مگر یوں نہ گُنگُناؤ گی
آنکھ میں ہوں گے سُرمہ آلود اشک — آہ! تم پھر بھی مُسکراؤ گی
آندھیوں کی زدوں میں آئی ہوئی — شمع کی طرح بجھتی جاؤ گی
آہ! یہ دُکھ بھرا نظامِ حیات — جس کے پنجے میں تِلمِلاؤ گی
آہ! یہ طوقِ رسم و راہِ جہاں — جس کو زیبِ گُلُو بناؤ گی
جس میں جلتا ہے دل سُہاگن کا — اُس جہنّم میں ہنستی جاؤ گی
مان لُوں کیا یہ میں کہ آج کی رات — آخری گیت اپنا گاؤ گی
پانی بھرنے کے اِک بہانے سے — اپنی گاگر اُٹھا کے آؤ گی
آ کے ندّی کنارے ، لہروں کو — دیر سے منتظر سا پاؤ گی
ایک لمحے کے بعد کیا ہوگا — اُن کی گودی میں تھرتھراؤ گی
زندگانی کے قید خانے کی — ساری زنجیریں کاٹ جاؤ گی

کاش! پہنچے یہی نوید مجھے
مِلے اِس خط کی یوں رسید مجھے

☆☆☆☆☆

خودکُشی

ہاں میں نے بھی سُنا ہے، تمھارے پڑوس میں
کل رات ایک حادثۂ قتل ہو گیا

ہاں، میں نے بھی سُنا ہے کہ اِک جام زہر کا
دو جیونوں کی ننھی سی نو کا ڈبو گیا

کوئی دُکھی جوان وطن اپنا چھوڑ کر
اپنی سکھی کے ساتھ اِک اور دیس کو گیا

دُنیا کے خار زار میں سو ٹھوکروں کے بعد
یوں آخر اُن کا قصۂ غم ختم ہو گیا

یوں طے کیا اُنھوں نے محبت کا مرحلہ
ایک ایک گھونٹ اور جو ہونا تھا ، ہو گیا

دونوں کی آنکھ میں تھا اِک اِک اشک مُنجمد
جو خُشک خُشک پلکوں کی نوکیں بھگو گیا

کچھ کہنے پائی تھی کہ وہ خاموش ہو گئی
کوئی جواب دینے کو تھا وہ کہ سو گیا

پیمانۂ اجل کا وہ تلخابہ اِس طرح
رُوحوں کے زخموں، سینوں کے داغوں کو دھو گیا

اکثر یونہی ہوا ہے کہ اُلفت کا امتحاں
دُشواریوں میں موت کی ، آسان ہو گیا

آؤ نا! ہم بھی توڑ دیں اِس دامِ زیست کو
سنگِ اجل پہ پھوڑ دیں اِس جامِ زیست کو

☆☆☆☆☆

مختار صدیقی

پیدائش: یکم مارچ،1919ء ...... سیالکوٹ، پاکستان

وفات: 18۔ستمبر،1972ء .... لاہور، پاکستان

مختار الحق صدیقی سیالکوٹ میں پیدا ہوئے لیکن تعلیمی مدارج گوجرانوالہ اور لاہور میں طے کیے۔ شاعری سے گہرا شغف تھا۔ سیماب اکبر آبادی کی شاگردی اِختیار کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے وابستگی اختیار کی اور ایک اچھے براڈ کاسٹر کی حیثیت سے نام کمایا۔ پھر پاکستان ٹیلی ویژن کے قیام کے بعد بطور اسکرپٹ ایڈیٹر منسلک ہو گئے۔

مختار صدیقی کے تین شعری مجموعے 'منزلِ شب'، 'سہ حرفی' اور 'آثار' کے نام سے شائع ہوئے۔ اُنھوں نے چینی مفکّر لن یوتانگ کی دو کُتب کے ترجمے 'جینے کی اہمیت' اور 'جینے کا قرینہ' کے نام سے کیے جو بہت مقبول ہوئے۔ اُردو کے اِس نامور شاعر، ادیب، نقاد اور براڈ کاسٹر پر جامعاتی تحقیق بعنوان 'مختار صدیقی: حیات و خدمات' ہوئی جو ڈاکٹر صابرہ شاہین کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے۔

اس مجموعے میں اُن کی نظم 'کھنڈر' شامل کی جا رہی ہے۔

کھنڈر

نہ یہ فنا ہے، نہ یہ بقا ہے
میانِ بُود و عدم یہ کیسا طویل وقفہ ہے
جو نوشتہ ہماری قسمت کا بن گیا ہے
کنارِ دریا کبھی یہ بستی تھی
لیکن اب نیستی و ہستی کے درمیان اِک مقامِ برزخ ہے
ایسا برزخ کہ جس میں صدیوں سے کاخ و کُو، بام و در مسلسل
شکستگی، خستگی، خرابی میں خیرہ سر ہیں
حدودِ ہستی سے ہم نکل کر کھنڈر بنے تھے
مگر کھنڈر بن کے مِٹ بھی جاتے
کہ یہ غمِ زندگی کے رسیا
ہماری ہستی کو اپنی یادوں سے محو کر دیتے، بھول جاتے
نہ یہ کہ ہم کو تماشہ گاہِ جہاں بناتے
ہمارے عبرت کدوں کو محفوظ کر کے رکھتے
نہ یہ کہ آبادیوں کی خاطر
ہماری بربادیوں کو تاریخی یادگاریں بنائے رکھتے
وہ یادگاریں
جہاں پہ یہ لوگ زندگی کے اجارہ دار آ سکیں تو آئیں
دِنوں کو راہوں کی خاک اُڑائیں
وہ بارگاہیں جو عرش پایہ تھیں ادب و آدابِ خسروی میں
وہاں یہ دراز کھسکتے جائیں
جہاں بھی جی چاہے اپنا نام اور شعر لکھیں

مچائیں غوغا، رقیق، بے معنی گیت گائیں
مگر نہ اوقاتِ پنج گانہ میں
ایک بھی وقت سونی مسجد میں جھانک پائیں
کسی کی تُربت پہ فاتحہ کے لیے نہ یہ اپنے ہاتھ اُٹھائیں
دِنوں کو یونہی فسردہ راہوں کی خاک اُڑائیں
دیئے جلے پر گھروں کو جائیں
ہماری ویرانیوں کو ویران تر بنا کر چلے ہی جائیں
یہاں پہ چھا جائے اندھی اندھیاریوں کا پھر وہ سکوتِ جامد
کہ یوم وسپر ہی جس کے ہم راز وہ ہم نفس ہیں
نہ دن کی وحشت میں کچھ کمی تھی
کہ شب کی دہشت میں کچھ کسر ہو
ہمارے دن رات ایک سے ہیں
ہمارے دن رات اِسی وجود وعدم کے اِک وقفۂ مسلسل میں
ہستی ونیستی کے برزخ میں پابہ گِل ہیں
ہمارے دن رات اسی ورائے زمان وقفے سے متصل ہیں
مگر ہمیں کب ملے گی اِس دام سے رِہائی
ہمیں ملے گا عدم کی معدوم و بے نشاں گود کا سکونِ ابد خدایا!
ہمیں ازل اور ابد کے چکر سے کب عطا ہو گی رستگاری؟
خدائے قیوم وحیّ وقائم
جنابِ باری!

☆☆☆☆☆

منوج اظہر

پیدائش: یکم جولائی، 1978ء ...... مرادآباد، اُترپردیشِ انڈیا

بقیدِ حیات ہیں۔

منوج کمار، منوج اظہر اُردو شاعری میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اُن کا بہت تھوڑا سا کلام منظرِ عام پر آیا ہے۔ غزل کے دو اشعار دیکھیئے:

☆ یوں چار دن کی بہاروں کے قرض اُتارے گئے
تمھارے بعد کے موسم فقط گزارے گئے

☆ صدا کا دیر تلک گونجنا بہت بھایا
پھر ایک نام بیاباں میں ہم پکارے گئے

اُنھوں نے اپنی نظم 'مرحوم' سے بہت شہرت حاصل کی جو پاک و ہند کے قارئین سے زبردست پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔

مرحوم

(والد کے لیے)

کبھی تصویر سے باہر نکل کر بول بھی اُٹھو
ہمیشہ ایک سا چہرہ لیے کیوں تکتے رہتے ہو
ذرا ہونٹوں کو جُنبِش اور لفظوں کو رِہائی دو
اکیلا پڑ گیا ہوں میں، ذرا میری صفائی دو

ماں اکثر مِری کھانسی پر تمھارا دھوکہ کھاتی ہے
یہ بُڑکی میری اِک عادت تمھاری سی بتاتی ہے
تمھاری یاد آتی ہے

کبھی پوچھو کہ اتنی رات کو کیوں گھر مَیں آتا ہوں
کبھی ڈانٹو کہ مَیں اس طرح، کیوں پیسے اُڑاتا ہوں
جنھیں تم ٹوکتے تھے میں وہ سارے کام کرتا ہوں
تمھارا نام کرنے سے رہا، بدنام کرتا ہوں

میں اِک ہوٹل میں سِگریٹ پی رہا ہوں، تم دِکھائی دو

میں رُوٹھا ہوں، مِرا کاندھا چُھوؤ
پھر مسکراؤ اور کھانے پر بلا لو

مجھے ڈر لگ رہا ہے آج
مجھ کو اپنے بستر پر سُلا لو
میں اِس میلے میں چل کر تھک گیا ہوں
اپنے کاندھے پر بٹھا لو
قدم پھر لڑکھڑاتے ہیں
مجھے اُنگلی دو، گرتا ہوں، سنبھالو
مجھے سر درد ہے، سر چُھو کے
اپنے لمس کی عمدہ دوائی دو

میں پھر سے پاس ہو کر آ گیا ہوں، تھپتھپاؤ
''تُو آخر میرا بیٹا ہے'' کہو، ماں کو چڑاؤ
مجھے پھر سے اُسی حلوائی کی لا کر مٹھائی دو

سُنو! اب لوگ اکثر پوچھتے ہیں
کس کے بیٹے ہو؟
تمھارا نام لیتا ہوں
تو وہ ''مرحوم'' کہتے ہیں
مگر نادان ہیں وہ
باپ بھی مرحوم ہوتا ہے؟

☆☆☆☆☆

نصیر کوی

پیدائش: اکتوبر، 1947ء ...... ٹِلہّ جوگیاں، جہلم، پاکستان

وفات: 24۔نومبر، 2014ء .... جہلم، پاکستان

نصیر جہلم کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کر پایا۔ تربیلا ڈیم کی تعمیر کے دوران ترکھان کی حیثیت سے نوکری کی۔ ازاں بعد مزدوری کے لیے سعودی عرب روانہ ہو گیا۔ چند سال وہاں گزارے تو کچھ ناخوش گوار یادوں کے ساتھ واپس پلٹ آیا۔

شاعری سے ابتداء سے ہی دلچسپی تھی اور مطالعے کا گہرا شغف تھا۔ تربیلا میں ملازمت کے دوران اپنی پنجابی شاعری اپنے مزدور ساتھیوں اور دوستوں کو سُنایا کرتا تھا۔ پنجابی سے بہت پیار تھا جس کا اظہار درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

☆ گنج شکر نے لوکاں دے نال جیہڑی بولی بولی
نانک ہوراں اشلوکاں وچ اوہدی شکر گھولی

☆ بھر بھر پیو پیالے ایہدے ایہہ امرت نہ ڈولھو
ماں بولی وچ لکھو پڑھو تے ماں بولی وچ بولو

لیکن نصیر کوی کا وہ کلام جو اُسے دُنیا بھر میں مشہور کر گیا اور اُسے ہمیشہ کے لیے امر کر گیا، وہ اُردو میں ہے۔ یہ نظم مزاحمت کی علامت کے طور پر دُنیا بھر میں پڑھی جاتی ہے۔

نصیر کا واحد مجموعہ کلام اُس کی وفات سے کچھ دیر پہلے 'ساڈے ہتھ اگنی داتا' کے نام سے شائع ہوا لیکن اُس کا اصل اثاثہ یہ نظم ہے جو اُس نے بھٹو کی سزائے موت پر لکھی۔ آیئے پڑھتے ہیں:

تم کتنے بُھٹو مارو گے؟

تم ڈاکو ، چور ، لٹیرے بھی نگرانی کرنے آئے ہو
تم خلقِ خدا کے ٹھکرائے سُلطانی کرنے آئے ہو
تم بھوکے ننگوں کے خوں کی ارزانی کرنے آئے ہو
تم ٹینکوں ، توپوں کے بل پر من مانی کرنے آئے ہو
تم آمر کے پروردہ ہو ، جمہور کے معنی کیا جانو؟
تم قاتل ہو دستوروں کے ، دستور کے معنی کیا جانو؟
تم فتویٰ گر ہو شاہوں کے ، منصور کے معنی کیا جانو؟
تم تاریکی کے پالے ہو ، تم نور کے معنی کیا جانو؟
ہم بھٹو کے دیوانے ہیں ، یہ جان امانت بھٹو کی
بی بی پہ کرنے آئے ہیں ، قربان امانت بھٹو کی
ہم آن پہ مرنے والے ہیں ، یہ آن امانت بھٹو کی
جس شان سے مقتل میں آئے ، وہ شان امانت بھٹو کی
کیوں اتنا بوجھ اُٹھاتے ہو؟ کل کیسے قرض اُتارو گے؟
تم اپنی جاں بخشی کے لیے پھر ہم سے عرض گزارو گے
یہ بازی جان کی بازی ہے اور تم یہ بازی ہارو گے
ہر گھر سے بھٹو نکلے گا ، تم کتنے بھٹو مارو گے؟

☆☆☆☆☆

نظیر اکبر آبادی

پیدائش: 1732/35ء ، دِلّی، انڈیا (اُتر پردیش میں نصاب میں شامل کتاب کے مطابق)

وفات: 16۔اگست، 1830ء .... آگرہ (اکبر آباد)، انڈیا

شیخ ولی محمد، نظیر اکبر آبادی دِلّی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے لڑکپن میں ہی آپ کا خاندان آگرہ منتقل ہو گیا۔ آپ ایک سادہ، قناعت پسند اور صوفی منش انسان تھے۔ تمام عمر درس و تدریس سے منسلک رہے۔ آپ کلاسیکی دور کے واحد اہم نظم گو ہیں۔ اُن کے موضوعات میں زبردست تنوع ہے۔ اُن کی نظمیں خواص کی بجائے عوام کے قریب نظر آتی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کو انگریزی، عربی، فارسی، اُردو، پنجابی، مارواڑی، پوربی اور ہندی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا لیکن آپ نے صرف اُردو کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ آپ نے دبستانِ دہلی یا لکھنؤ، کسی کی پابندی قبول نہیں کی اور اپنی آزاد منش طبیعت کے ساتھ خوب صورت نظم تخلیق کی۔ آپ کو لسان العصر، عوامی شاعر اور اُردو شاعری کا چاسر (Geoffrey Chaucer) اور شیکسپیئر بھی کہا گیا۔

آپ کی نظمیں 'آدمی نامہ'، 'مفلسی'، 'روٹیاں'، 'چڑیوں کی تسبیح' اور 'جب عاشق مست فقیر ہوئے' بہت مقبول ہوئیں۔ اِس مجموعے کے لیے مؤخر الذکر کا انتخاب کیا گیا ہے۔

جب عاشق مست فقیر ہوئے

ہیں عاشق اور معشوق جہاں واں شاہ وزیری ہے بابا
نہ رونا ہے نہ دھونا ہے نہ درد اسیری ہے بابا
دن رات بہاریں چہلیں ہیں اور عشق سفیری ہے بابا
جو عاشق ہوئے سو جانے ہیں یہ بھید فقیری ہے بابا
ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دل گیری ہے بابا

ہے چاہ فقط اِک دلبر کی پھر اور کسی کی چاہ نہیں
اِک راہ اُسی سے رکھتے ہیں پھر اور کسی سے راہ نہیں
یاں جتنا رنج و تردد ہے ہم ایک سے بھی آگاہ نہیں
کچھ مرنے کا سندیہہ نہیں کچھ جینے کی پرواہ نہیں
ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دل گیری ہے بابا

کچھ ظلم نہیں کچھ زور نہیں کچھ داد نہیں فریاد نہیں
کچھ قید نہیں کچھ بند نہیں کچھ جبر نہیں آزاد نہیں
شاگرد نہیں اُستاد نہیں ویران نہیں آباد نہیں
ہیں جتنی باتیں دُنیا کی سب بھول گئے کچھ یاد نہیں
ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دل گیری ہے بابا

جس سمت نظر بھر دیکھے ہیں اُس دلبر کی پھلواری ہے
کہیں سبزی کی ہریالی ہے کہیں پھولوں کی گُل کاری ہے

دن رات مگن خوش بیٹھے ہیں اور آس اُسی کی بھاری ہے
بس آپ ہی وہ داتاری ہے اور آپ ہی وہ بھنڈاری ہے
ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دل گیری ہے بابا

نت عشرت ہے نت فرحت ہے نت راحت ہے نت شادی ہے
نت مہر و کرم ہے دلبر کا نت خوبی خوب مرادی ہے
جب اُمڈا دریا اُلفت کا ہر چار طرف آبادی ہے
ہر رات نئی اِک شادی ہے ہر روز مبارک بادی ہے
ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دل گیری ہے بابا

ہے تن تو گل کے رنگ بنا اور منہ پر ہردم لالی ہے
جُز عیش وطرب کچھ اور نہیں جس دن سے سُرت سنبھالی ہے
ہونٹوں میں راگ تماشے کا اور گت پر بجتی تالی ہے
ہر روز بسنت اور ہولی ہے اور ہر اِک رات دیوالی ہے
ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دل گیری ہے بابا

ہم چاکر جس کے حُسن کے ہیں وہ دلبر سب سے اعلا ہے
اُس نے ہی ہم کو جی بخشا اُس نے ہی ہم کو پالا ہے
دل اپنا بھولا بھالا ہے اور عشق بڑا متوالا ہے
کیا کہیے اور نظیر آگے اب کون سمجھنے والا ہے
ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دل گیری ہے بابا

☆☆☆☆☆

ن۔م۔راشد

پیدائش: یکم اگست، 1910ء ...... علی پور چٹھہ، گوجرانوالہ، پاکستان

وفات: 9۔اکتوبر، 1975ء .... لندن، برطانیہ

گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل نذر محمد جنجوعہ، ن۔م۔راشد علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک سے بہت متأثر تھے۔اِسی دوران شاعری شروع کی۔اُردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں لکھا۔وہ نرم اور ملائم شاعرانہ جذبات کے نہیں بلکہ سخت اور کھردرے جذبات کے شاعر تھے۔اُن کا پہلا مجموعہ 'ماورا' کے نام سے شائع ہوا جسے جدید نظم کا حرفِ اوّل کہا جاتا ہے۔ ازاں بعد 'ایران میں اجنبی'، 'لا = انسان' اور 'گمان کا ممکن' اشاعت پذیر ہوئے۔اُن کی نظم 'حسن کوزہ گر' جو چار حصّوں میں شائع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی۔

راشد نے پاکستان سے ترکِ سکونت کر کے لندن میں ڈیرے جمائے اور وہاں شیلا انجلینی نامی خاتون سے شادی کی۔1975ء میں لندن میں جب اُن کا انتقال ہوا تو وہاں صرف دو افراد موجود تھے .... شیلا اور ساقی فاروقی۔بعض لوگ عبداللہ حسین کا بھی ذکر کرتے ہیں۔بقول ساقی، شیلا نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے راشد کے جسم کو جلوا دیا۔بعض کا خیال ہے کہ ایسا اُن کی وصیت کے مطابق کیا گیا۔یہ کام اِتنی عُجلت میں کیا گیا کہ لندن میں مقیم اُن کے بیٹے شہریار سے بھی مشاورت نہ کی گئی۔

اِس مجموعے کے لیے ہم نے اُن کی اِن نظموں کا انتخاب کیا ہے:

داشتہ

ابولہب کی شادی

اندھا کباڑی

اندھا کباڑی

شہر کے گوشوں میں ہیں بکھرے ہوئے
پا شکستہ سر بُریدہ خواب
جن سے شہر والے بے خبر!
گھومتا ہوں شہر کے گوشوں میں روز و شب
کہ ان کو جمع کر لوں
دل کی بھٹی میں تپاؤں
جس سے چھٹ جائے پرانا میل
اُن کے دست و پا پھر سے اُبھر آئیں
چمک اُٹھیں لب و رُخسار و گردن
جیسے نو آراستہ دولھوں کے دل کی حسرتیں
پھر سے ان خوابوں کو سمتِ رہ ملے!

''خواب لے لو خواب ....''
صُبح ہوتے چوک میں جا کر لگاتا ہوں صدا............
''خواب اصلی ہیں کہ نقلی؟''
یوں پرکھتے ہیں کہ جیسے اُن سے بڑھ کر
خواب داں کوئی نہ ہو!
خواب گر میں بھی نہیں

صورت گرِ ثانی ہوں بس ....

ہاں مگر میری معیشت کا سہارا خواب ہیں!

شام ہو جاتی ہے

میں پھر سے لگاتا ہوں صدا ....

''مفت لے لو مفت، یہ سونے کے خواب ....''

''مفت''، سُن کر اور ڈر جاتے ہیں لوگ

اور چپکے سے سرک جاتے ہیں لوگ ....

دیکھنا، یہ ''مفت'' کہتا ہے

کوئی دھوکا نہ ہو؟

ایسا کوئی شعبدہ پنہاں نہ ہو؟

گھر پہنچ کر ٹوٹ جائیں

یا پگھل جائیں یہ خواب؟

بھک سے اُڑ جائیں کہیں

یا ہم پہ کوئی سحر کر ڈالیں یہ خواب ....

جی نہیں کس کام کے؟

''ایسے کباڑی کے یہ خواب

ایسے نابینا کباڑی کے یہ خواب!''

رات ہو جاتی ہے

خوابوں کے پلندے سر پہ رکھ کر

مُنہ بسورے لوٹتا ہوں

رات بھر پھر بڑبڑاتا ہوں

"یہ لے لو خواب ...."

اور لے لو مجھ سے ان کے دام بھی

خواب لے لو، خواب ....

میرے خواب ....

خواب .... میرے خواب ....

خوااااب ....

اِن کے دااااام بھی ی ی ی ...."

☆☆☆☆☆

داشتہ

میں ترے خندۂ بے باک سے پہچان گیا
کہ تری رُوح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے،
کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے، کوئی الم زہرہ گداز
میں تو اِس پہلی ملاقات میں یہ جان گیا!
آج یہ دیکھ کے حیرت نہ ہوئی
کہ تری آنکھوں سے چُپ چاپ برسنے لگے اشکوں کے سحاب؛
اِس پہ حیرت تو نہیں تھی، لیکن
کسی ویرانے میں سمٹے ہوئے خوابیدہ پرندے کی طرح
ایک مبہم سا خیال
دفعتاً ذہن کے گوشے میں ہُوا اِبال فشاں:
کہ تجھے میری تمنا تو نہیں ہو سکتی
آج، لیکن مری باہوں کے سہارے کی تمنّا ہے ضرور،
یہ ترے گریۂ غم ناک سے میں جان گیا۔

تجھ سے وابستگیٔ شوق بھی ہے،
ہو چلی سینے میں بیدار وہ دل سوزی بھی
مجھ سے مہجورِ ازل جس پہ ہیں مجبورِ ازل!

نفسِ خود بیں کی تسلی کے لیے

وہ سہارا بھی تجھے دینے پہ آمادہ ہوں

تجھے اندوہ کی دلدل سے جو آزاد کرے

کوئی اندیشہ اگر ہے تو یہی

تیرے اِن اشکوں میں اِک لمحے کی نومیدی کا پرتَو ہو تو کہیں،

اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جائے

یہ سہارا ترِی رُسوائی کا اِک اور بہانہ بن جائے!

جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا امردِ لئیم

جسم کی مزدِ شبانہ دے کر

بن کے رازق ترِی تذلیل کیے جاتا ہے

میں بھی باہوں کا سہارا دے کر

تیری آئندہ کی توہین کا مجرم بن جاؤں!

☆☆☆☆☆

ابولہب کی شادی

شبِ زفافِ ابولہب تھی، مگر خُدایا وہ کیسی شب تھی،
ابولہب کی دُلھن جب آئی تو سر پہ ایندھن، گلے میں
سانپوں کے ہار لائی، نہ اس کو مشّاطگی سے مطلب
نہ مانگ غازہ، نہ رنگ وروغن، گلے میں سانپوں
کے ہار اس کے، تو سر پہ ایندھن!
خدایا کیسی شبِ زفافِ ابولہب تھی!

یہ دیکھتے ہی ہجوم بپھرا، بھڑک اُٹھے یوں غضب
کے شعلے، کہ جیسے ننگے بدن پہ جابر کے تازیانے!
جوان لڑکوں کی تالیاں تھیں، نہ صحن میں شوخ
لڑکیوں کے تھرکتے پاؤں تھرک رہے تھے
نہ نغمہ باقی نہ شادیانے!

ابولہب نے یہ رنگ دیکھا، لگام تھامی، لگائی
مہمیز، ابولہب کی خبر نہ آئی!

ابولہب کی خبر جو آئی، تو سال ہا سال کا زمانہ
غبار بن کر بکھر چکا تھا!

ابولہب اجنبی زمینوں کے لعل و گوہر سمیٹ کر
پھر وطن کو لَوٹا، ہزار تیز و طرّار آنکھیں، پُرانے
غُرفوں سے جھانک اُٹھیں، ہجوم، پیر و جواں کا
گہرا ہجوم، اپنے گھروں سے نکلا، ابولہب کے جلوس
کو دیکھنے کو لپکا!

''ابولہب!'' اِک شبِ زفافِ ابولہب کا جلا
پھپھولا، خیال کی ریت کا بگولا، وہ عشقِ برباد
کا ہیولا، ہجوم میں سے پکار اُٹھی: ''ابولہب!
تُو وہی ہے جس کی دُلہن جب آئی، تو سر پہ ایندھن
گلے میں سانپوں کے ہار لائی!''

ابولہب ایک لمحہ ٹھٹکا، لگام تھامی، لگائی
مہمیز، ابولہب کی خبر نہ آئی!

☆☆☆☆☆

وقار انبالوی

پیدائش: 22۔جون،1896ء ...... انبالہ،انڈیا

وفات: 26۔جون،1988ء ...... شیخوپورہ، پاکستان

شاعر،افسانہ نگاراور صحافی سیّد کاظم علی، وقار انبالوی تحریکِ پاکستان کے عہد کی ایک معروف مُسلم شخصیت تھیں۔ لاہور کے اُردو اخبارات میں کام کرتے رہے اور شعرو ادب میں بھرپور دلچسپی لیتے رہے۔تحریکِ پاکستان میں دلچسپی کے جرم میں اُن کے ڈیڑھ سالہ بچّے کو برچھے سے شہید کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی۔اس برچھے کا نشان اُن کے فرزند عارف وقار کے جسم پر ہمیشہ موجود رہا۔یاد رہے، یہ وہی عارف وقار ہیں جنھوں نے پی۔ٹی۔وی ، وائس آف امریکہ اور بی بی سی میں خدمات انجام دے کر نام کمایا۔بحیثیت پروڈیوسر اُن کا ڈرامہ 'دوبئ چلو' بہت مقبول ہوا۔

وقار انبالوی کا واحد شعری مجموعہ 'آہنگِ رزم' 1937ء میں شائع ہوا۔اُنھوں نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی لیکن اُن کی نظمیں بہت مقبول ہوئیں۔درج ذیل شعر جسے حضرت اقبال سے منسوب کیا جاتا ہے، وقار انبالوی کے کلام کے نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اِسلام کے دامن میں اور اِس کے سِوا کیا ہے   اِک ضربِ یداللٰہی اِک سجدۂ شبیری

اِس مجموعہ میں اُن کی نظم 'کیا کیا دیکھا' شامل کی جارہی ہے۔

کیا کیا دیکھا

ہو نہیں سکتا بیاں آنکھ نے کیا کیا دیکھا
دیر تک اپنے مقدّر کا تماشا دیکھا
دیر تک صبحِ وطن شامِ غریباں ہی رہی
دیر تک دیس میں پردیس کا نقشہ دیکھا
ایک کی ہم نے ہزاروں سے لڑائی دیکھی
نرغۂ کفر میں ایمان کا جلوہ دیکھا
لڑ گئے ، گرچہ نہتّے بھی تھے ، محصور بھی تھے
دیکھا! یہ شوقِ شہادت کا تقاضا دیکھا
ہم نے بدلے ہوئے احباب کے تیور دیکھے
ہم نے بپھرے ہوئے اغیار کا تیہا دیکھا
ہم نے بدلی ہوئی ہر چیز کی صورت دیکھی
ہم نے بگڑا ہوا ہر کام کا نقشہ دیکھا
جان محفوظ نہ اولاد نہ عزّت نہ منال
سامنے آنکھوں کے گھر بار کو لُٹتا دیکھا
ہم نے قانون کو انصاف کو مُردہ پایا
ہم نے تہذیب کو اخلاق کو رُسوا دیکھا
زندگی خوف و تباہی کے سِوا کچھ بھی نہ تھی
درد وہ درد کہ جس کا نہ مداوا دیکھا
ہم نے وہ دیکھا کہ دشمن کو دِکھائے نہ خدا
جس طرف اُٹھی نظر موت کا پہرہ دیکھا
وہ سخی ، حاتمِ ثانی جنھیں کہتے تھے سبھی
اُن کا فاقوں سے اُترتا ہوا چہرہ دیکھا

وہ جری ، جن کے اشاروں پہ قضا کھیلتی تھی
اُن کو مجبوری و حسرت کا سراپا دیکھا
بھوک میں سہمے ہوئے بچوں کی صورت دیکھی
چوٹ کھا کھا کے بزرگوں کو تڑپتا دیکھا
باپ کے سامنے بیٹوں کے گلے کٹتے تھے
ماؤں کی گود میں بچوں کو بلکتا دیکھا
شِیر خواروں کے گلے خون میں تر دیکھے ہیں
نوجوانوں کو تہِ تیغ تڑپتا دیکھا
بارشوں میں کہیں سایہ تھا نہ دیوار نہ در
کبھی پالا نہ پڑا جس سے وہ پالا دیکھا
ہم نے بربادئ تہذیب کی صورت دیکھی
ہم نے بے دردئ کفّار کا نقشہ دیکھا
ہم نے توہینِ مساجد کے مناظر دیکھے
ہم نے تذلیلِ مقابر کا تماشا دیکھا
عصمتِ دُخترِ اسلام سے کھیلے کافر
جبر کے کاندھوں پہ غیرت کا جنازہ دیکھا
ہم نے جس سوزِ حمیّت سے قفس پھونکے تھے
آشیانوں کو اُسی آگ میں جلتا دیکھا
دیکھتے جاتے تھے اور کچھ بھی نہ کر سکتے تھے
تھے جو مجبورِ نظر ، جو نظر آیا دیکھا
تیری منزل جو قریب آئی مِرے پاک وطن!
خُون کے سیل میں ڈوبا ترا رستہ دیکھا
اِتنے آلام و مصائب سے نمٹ کر نکلے
تب کہیں جا کے تِرا چاند سا مُکھڑا دیکھا

یوسف ظفر

پیدائش: یکم دسمبر، 1914ء .... مری، پاکستان

وفات: 7۔مارچ، 1972ء ...... راولپنڈی، پاکستان

شیخ محمد یوسف، یوسف ظفر کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا۔ آپ نے صحافی، ڈرامہ نگار، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی۔ 1939ء میں میراجی کے ساتھ حلقۂ اربابِ ذوق کی بنیاد ڈالی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اپنے عہد کے معروف جریدے 'ہمایوں' کے ایڈیٹر بنے۔ ازاں بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور ریجنل ڈائریکٹر کے عُہدے تک ترقی پائی۔ جدید نظم کے نمائندہ شاعر ہیں۔ اُن کے شعری مجموعوں میں 'نوائے ساز'، 'عشق پیچاں'، 'حریمِ وطن'، 'صدا بہ صحرا'، 'زہر خند' اور 'زنداں' کے نام شامل ہیں۔ تصدق حسین راجا نے 2005ء میں 'کلیاتِ یوسف ظفر' مرتب کر کے اُن کا تمام کلام محفوظ کر دیا۔

یوسف ظفر کی کتاب 'یہودیت' بھی اپنے موضوع پر ایک وقیع تصنیف ہے۔ اُن کی سوانح عمری 'یوسف ظفر کی بات' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

ظفر نے بہت خوب صورت نظمیں تخلیق کیں جن میں 'پُرانی قدریں'، 'تقلیدِ ابراہیم' اور 'وادیٔ نیل' بہت مقبول ہوئیں۔

وادیٔ نیل

(قلوپطرہ۔ساحرۂ مصر۔جو ہر رات ایک اجنبی عاشق کی آغوش میں ہوتی اور دوسرے دن سحر کی پہلی کرن کے ساتھ، اُسے اپنی ناگنوں سے ڈسوا کر موت سے ہمکنار کر دیتی .... روایت)

جمالِ مرگ آفریں! یہ شب میری زندگی ہے
نچوڑ دے اس کے چند لمحوں کی عشرتوں میں
وہ مے، وہ نشہ کہ ساغرِ ماہ و سال میں ہے
وہ مے کہ تیرے جمال میں ہے
وصال میں ہے
وصال! .... تیرا وصال!!......وہ شعلۂ اجل ہے
کہ جس میں جل کر کئی پتنگے ابد کی منزل کو پا چکے ہیں
ابد کی منزل!......سحر کی پہلی کرن، وہ ناگن
کہ میرے سینے سے آخری سانس بن کے پلٹے گی۔ آمِری جاں!
جمالِ مرگ آفریں! یہ شب میری زندگی ہے

مِرے لبوں نے وہ لب بھی چومے ہیں جن میں مرگِ گراں نہیں تھی
وہ پھول سے لب کہ جن کی تہ دار پتیوں میں
تمازتِ بادۂ وفا تھی
مِرے جواں سال بازوؤں نے
دھڑکتے مرمر کی ان چٹانوں سے رس نچوڑا ہے زندگی کا

جنھیں گماں تھا کہ میرے پہلو میں دم نکلنا ہی زندگی ہے
مِرے ہی سینے پہ جاگتی ہیں ابھی وہ راتیں
کہ جن میں اُبھرے ہیں آفتابِ جمال میری مسرتوں کے
وہ آفتابِ جمال جو کل سحر کی پہلی کرن کے ڈسنے سے میرے ہمراہ جل بجھیں گے

تِرے تبسّم کی لَو اُبھرتی ہی جا رہی ہے
تجھے نظر آ رہی ہے شاید وہ زیست جو لاش بن کے تڑپے گی کل سحر کو
مگر میں کچھ اور دیکھتا ہوں
اگر میں یہ شب گزار دیتا گرسنہ شیروں کے جنگلوں میں
جہاں ہر اِک لحظہ موت مُنہ پھاڑ کر جھپٹتی ہے بے بسی پر!............
اگر میں یہ شب گزار دیتا کسی سمندر کے سرد سینے کی دھونکنی پر
جہاں ہر اِک لحظہ موت منہ پھاڑ کر جھپٹتی ہے بے بسی پر!......
اگر میں یہ شب گزار دیتا کسی غمِ مرگ آفریں میں کہ جس کے چُنگل سے لحظہ لحظہ لہو ٹپکتا
ہے آرزو کا!
عجب نہ تھا آج شب اگر کوئی میرا دُشمن
مِرے بدن سے بنوکِ خنجر نکال دیتا وہ خوں
جو اَب میری زندگی ہے
جو اَب ترے پیکرِ مسرت کی وادیوں میں
مِری حقیقت کا راز داں ہے
قبول ہے مجھ کو آج کی شب............سحر ہے جس کی ابد کی منزل
جمالِ مرگ آفریں! یہ شب میری زندگی ہے۔

مِرا مقدر!......کہ آج کی شب ہے مجھ کو حاصل یہ تیرا پیکر

مِرا مقدر!!......کہ میں نے خود موت کو پکارا ہے تیری خاطر

مِرا مقدر!!!......کہ میں ہوں وہ موت کا مسافر

جو اپنی منزل پہ آ گیا ہے ترے شبستاں میں خود ٹھہر کر

ترے لبوں سے حیات پا کر

ترے جمالِ حیات پرور سے لَو لگا کر

تِری نگاہوں کی گہری جھیلوں میں تیر کر، مشعلیں جلا کر

گداز پیکر کی ریشمیں چلمنیں اُٹھا کر

دھڑکتے دل میں ترانے بو کر، زمانے لا کر

ازل ابد کو سمیٹ کر، بے کراں بنا کر

تِرے بدن کی لطافتوں میں مسرتِ زندگی ملا کر

ترے لہو میں شرارے بھر کر، حرارتِ جاوداں بسا کر

تِرے خمستانِ دلبری کو جہاں میں اِک داستاں بنا کر

تجھے اجل سے قریب لا کر

حقیقتِ زندگی دکھا کر............

کہ میں ہوں وہ موت کا مسافر

تِرے شبستاں کے چور دروازے سے گزر کر

جو اپنی منزل پہ آ گیا ہے ....

وہ لوگ جو رو رہے ہیں مجھ کو

کہ میں نے خود موت کو پکارا ہے تیری خاطر

وہ لوگ کیا جانیں زندگی کو

اُنھیں خبر کیا کہ موت ہر لحظہ اُن کی ہستی کو کھا رہی ہے
اُنھیں خبر کیا کہ لحظہ لحظہ اُنھیں یوں ہی موت آ رہی ہے
اُنھیں خبر کیا کہ زندگی کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں زندگی کو
کہ آج کی شب یہ زندگی میری زندگی ہے
یہ زندگی ہے مری۔ جسے میں نے آج کی شب
ترے مسرت کدے میں لا کر
ابد سے ہم دوش کر دیا ہے
اجل کو خاموش کر دیا ہے
تھرک رہا ہے ترا بدن لذتِ طرب سے
چمک رہی ہیں تری نگاہیں خمارِ شب سے
اُچک اُچک کر سحر مجھے دیکھنے لگی ہے
سحر کا تھا انتظار کب سے

☆☆☆☆☆